بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شمارہ مارچ 2024ء

ادبی سلسلہ نمبر 8

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصرؔ
اداسی بال کھولے سو رہی ہے

ناصر کاظمی

شمارہ مارچ 2024ء

ادبی سلسلہ نمبر 8

انچارج	ثنا اکرم ملھی
چیف ایڈیٹر	تنہاؔ لائلپوری

رابطے کا ذریعہ:

tanhalyallpuri@gmail.com

0305-8545555

فہرست

اداریہ

ثنا اکرم ملہی

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ
ماہنامہ القلم اردو جہانیاں کی جانب سے پیارے قارئین کے لیے بہت سا پیار اور نیک خواہشات۔
عزیز قارئین کرام امید ہے سب بخیر و عافیت ایک خوبصورت مگر شدید موسم کو الوداع کہہ رہے ہوں گے۔
اپنے اپنے لامکاں سے اپنے مکاں تک رحمٰن کے حمد کناں بہار اور مومنوں کی بہار کی آمد کے لیے خاص تیاریاں ہو رہی ہیں۔ الحمدللہ ہماری دعائیں کہ الٰہی بلغنا فی رمضان چند دن کی مسافت پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری سال بھر کی لغزشوں کو معاف کر کے ہمارے حقیر کاوشوں کو قبول فرمائے۔
آمین!
آپ کے ماہنامہ میں قلمی دانشور اور صاحبِ علم و فراست اپنے قلم سے نہ صرف اصناف کو دوام بخش رہے ہیں بلکہ اسلافِ ادب کو بھی خاطر میں رکھنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔

مارچ کا شمارہ خاص طور پر لا رہا ہے آپ کے لیے مزیدار شاعری، افسانے، کالم اور دیگر اصناف پر مبنی نئے نئے خیالات جو آپ کو ذہنی آسودگی کے ساتھ نئے قلم کاروں سے ملوائیں گے۔ ہمارے ساتھ سرحد پار سے مقیتہ وسیم، محمد فرید فرہاد، رفیق چوگلے، ڈاکٹر نایاب ہاشمی اور رقیہ مظفر پوری بھی اصحابِ قلم میں شامل ہیں۔ امید کرتے ہیں آپ کو اس ماہ کا شمارہ بے حد پسند آئے گا۔
آئندہ ماہ کا شمارہ رمضان نمبر ہو گا جس میں آپ رمضان اور عیدالفطر کے حوالے سے تحاریر مل سکیں گی۔
ضرور پڑھیے اور دوسروں کو پڑھائیے، بعد از مطالعہ اپنے پسندیدہ ماہنامہ کے پیارے قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کرنا ہرگز نہ بھولیں، آپ کے اظہارِ رائے کے منتظر۔
شاد رہیں، پڑھتے رہیں، لکھتے رہیں۔

حمد

الطاف حسین حالی

اے زمین، آسمان کے مالک
ساری دنیا، جہان کے مالک

تیرے قبضے میں سب خدائی ہے
تیرے ہی واسطے بڑائی ہے

آئی موسم سے تنگ جب خلقت
تُو نے موسم کی دی بدل صورت

گرمیاں ہو گئیں اجیرن جب
تُو نے برسات بھیج دی یا رب

سب کے گرمی سے تھے خطا اوسان
مینھ برسنے سے آئی جان میں جان

گئے جب لوگ مینھ سے سب گھبرا
حکم سے تیرے چل پڑی پچھوا

جاڑا آ پہنچا اور گئی برسات
دم کے دم میں بدل گئے دن رات

پھر لگی پڑنے جب بہت سردی
مشکل آسان تُو نے پھر کر دی

جاڑا آخر ہوا اور آئی بہار
جنگل اور ٹیلے ہو گئے گلزار

تُو یوں ہی رت پہ رت بدلتا رہا
یوں ہی دنیا کا کام چلتا رہا
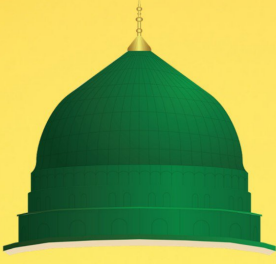
نعت

الطاف حسین حالی

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ

خطا کار سے درگزر کرنے والا
بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا

مفاسد کو زیر و زبر کرنے والا
قبائل کو شیر و شکر کرنے والا

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

مسِ خام کو جس نے کندن بنایا
کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا

عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا
پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا

رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
ادھر سے ادھر پھر گیا رخ ہوا کا

بندگی

عائشہ نظیر

مجھے بغیر لاجک کے چیزیں سمجھ نہیں آتی اور نہ مجھے سنی سنائی یا پڑھی پڑھائی چیزوں سے کنوینس کیا جا سکتا ہے۔ مجھے اگر کوئی کہے گا کہ نماز پڑھو کیونکہ یہ ضروری ہے تو میں نہیں پڑھوں گی۔ کیونکہ مجھے لوجیکل ریزننگ (logical reasoning) کے بغیر کسی چیز کو کرنے کے لئے مجبور نہیں کیا جا سکتا اور میں اپنے سوالوں کے جواب لینے اب کبھی کسی کے پاس نہیں جاتی بلکہ خود تلاش کرتی ہوں۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ جسے تم باہر تلاش کر رہے ہو وہ تمھارے اندر موجود ہے۔ میری سوچ کو رخ اقبال کے اس شعر نے دیا:

ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

میں نے غور کرنا شروع کیا۔ میں نے دیکھا کہ ہم نماز پڑھتے کیسے ہیں۔ ہم کھڑے ہوتے ہیں عاجزی کے ساتھ ہاتھ باندھ کے، پھر جھکتے ہیں اور پھر سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ پھر ہم بیٹھتے ہیں مالک کے سامنے، پھر سجدہ کرتے ہیں اور پھر کھڑے ہوتے ہیں۔

ہم اس کے سامنے جھکنے سے پہلے بھی کھڑے ہوتے ہیں اور جھکنے کے بعد بھی کھڑے ہوتے ہیں۔ جب ہم اس کو سجدہ کرتے ہیں تو درمیان میں دو سجدوں کے بیٹھتے ہیں۔ مالک کے سامنے وہ ہمیں سامنے بٹھاتا ہے عزت کے ساتھ۔ دو سجدوں کے درمیان بیٹھنا مجھے لگتا ہے مالک کا عزت دینے کا انداز ہے اور پھر ہم کھڑے ہوتے ہیں۔ ہم اس کے سامنے جھکنے سے پہلے بھی کھڑے ہوتے ہیں اور اس کے سامنے جھکنے کے بعد بھی کھڑے ہوتے ہیں۔ اس کے سامنے جھکنا ہمیں کھڑا ہونا سکھاتا ہے۔ دوسری بات جو مجھے سمجھ آئی وہ یہ تھی کہ ہر بندے میں بندگی کا عنصر ہے۔ جو اس کے آگے نہیں جھکتے وہ بھی کسی نہ کسی کے آگے جھکتے ضرور ہیں۔ لہٰذا جب ہم روز کے 5 وقتوں کے سجدے مکمل کر لیتے ہیں تو ہم بندگی کا اقرار کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد ہم کسی کے آگے نہیں جھکتے۔ کیونکہ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جس کے آگے جھکنے کا حق ہے وہ اپنے آگے جھکنے کا حق ضرور ادا کرے گا۔

یومِ یکجہتیِ کشمیر

عائشہ شاہد

نسلِ نو کو یہ تو پتا ہے کہ 5 فروری کو پورے پاکستان میں عام تعطیل ہوتی ہے لیکن اکثریت کو نہیں پتہ کہ تعطیل ہوتی کیوں ہے؟ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس دن کیا ہوا تھا؟ یہ دن کیوں منایا جاتا ہے؟ اور دن منا لینے سے کیا ہوتا ہے؟ کشمیر جس کو پاکستان کی شہ رگ کہا جاتا ہے۔ پاکستانی حکومت اور عوام کیا کر سکے ہیں کشمیر کے لیے؟ زبانی جمع خرچ، دن منا لینا، چند بڑے شہروں میں احتجاجی مظاہرے یا چند جلوس، بس کافی ہیں؟

جنت نظیر، وادیِ کشمیر پاکستان اور ہندوستان کا اہم تنازعہ جو ان کو کبھی ملنے نہیں دے گا۔ جب کہ بھارت کا شمار پاکستان کے ہمسایہ ممالک میں ہوتا ہے۔ 1947ء میں جب لارڈ ماونٹ بیٹن برصغیر کو پاک و ہند میں تقسیم کر رہا تھا تب کشمیر کی عوام جو اکثریت میں مسلمان تھے۔ پاکستان میں شامل ہونا چاہا لیکن اس وقت کی حکومت مہاراجہ گلاب سنگھ کے پاس تھی۔

بھارت سے ملی بھگت کر کے یہ علاقہ پیسوں کے عوض بھارت کو بیچ دیا اور ہندوستان نے اس پر قبضہ کر لیا۔ پاکستان کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوئے 75 سال ہو چکے ہیں تو خطہ کشمیر کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے بھی 75 سال ہو گئے ہیں۔ اتنے چھوٹے سے خطہ میں ہندوستان نے 9 لاکھ کی فوج تعینات کی ہوئی ہے۔ جو جنت نظیر وادی میں خون کی ہولی کھیل رہے ہیں۔ ایک نسل کو آزادی کے خواب دیکھنے کے جرم میں تہ تیغ کر ڈالا ہے۔ اور اب نسلِ نو اس کا خراج دے رہی ہے۔ ماؤں کے سامنے بیٹوں کو قتل کیا جاتا ہے تو باپ، بھائی کے سامنے بہنوں کی عصمت دری کی جاتی ہے۔ کون سا ظلم ہے جو ہندوستان نے روا نہیں رکھا لیکن اہلِ کشمیر کے کسی بچے سے بھی آزادی کا نعرہ نہ چھین سکے۔

یومِ یکجہتی کشمیر

عائشہ شاہد

بھارت کا بہیمانہ سلوک، قتل و غارت، کرفیو، ہڑتالیں، بنیادی سہولتوں کا فقدان، ناانصافی کوئی بھی ظلم اہلِ کشمیر کے کسی بھی شہری چاہے وہ بوڑھا ہو، جوان، بچہ یا صنف نازک ہو ان کی آنکھوں سے نہ آزادی کے خواب چھین سکے ہیں، نہ دلوں سے آزادی کا جوش ختم کر سکے۔ مائیں اپنے بچوں کو قربان کر کے بھی، خود آزادی کے لیے قربان ہونے کو تیار ہیں۔ کتنے عظیم رہنما قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر کے ہر طرح کی اذیت سے دوچار ہو کر اپنی جان کی بھی قربانی سے دریغ نہیں کرتے۔ کتنے جنازے ایک دن میں اٹھائے جاتے ہیں۔ پھر بھی بھارت کی ہٹ دھرمی اور ظلم ان کے حوصلے پست نہ کر سکا۔ کتنے ممالک ہیں امریکہ، سعودی عرب، چین اور جاپان، اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل، دوسرے غیر ملکی ادارے کوئی بھی ہندوستان کو 75 سال سے ہونے والی اس بربریت سے کبھی نہ روک سکا۔

اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل کی قراردادوں کو نظر انداز کر کے ہندوستان ہٹ دھرمی، ناانصافی زور زبردستی سے کشمیر پہ اپنا تسلط قائم رکھے ہوئے ہے۔ اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل کی قراردادوں کے مطابق کشمیری مسلمانوں سے ان کا رائے شماری کا حق بھی غصب کیا ہوا ہے۔ پاکستان کا حصہ بننے نہیں دیتے نہ سہی کشمیر کو ایک الگ ریاست تو بننے دیں۔ 75 سال میں بھارت کو اتنا تو اندازہ تو ہونا چاہیے کہ کشمیر کے لوگ ہار ماننے والے نہیں ہیں اور اپنی آزادی کی خاطر کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ اللہ نے چاہا تو اہلِ کشمیر ایک دن اپنی قربانیوں کا صلہ آزادی کی صورت میں پا لیں گے۔ آمین! اللہ ان کا حامی و ناصر ہو۔

مرجع خلائق (قسط#2)

افتخار یونس

کوئٹہ ملازمت کے دوران ککا محمد نور، چاچا رحمت حسین اور علی بہادر چاچا نے میرا بہت خیال رکھا۔ ہر طرح کی بر وقت ضرورت پوری کرتے تھے وہ میرے مطالعے کے لئے رسالے اور ڈائجسٹیں لا کر دیتے تھے۔ اب جبکہ وہ تینوں اس دنیا میں نہیں ہیں تو مجھے ان کے ساتھ گزرے لمحات بہت یاد آتے ہیں اللہ ان کی مغفرت کرے۔

1964 ء \ 65 میں گھر سنگولہ آ گیا اور راولاکوٹ ایس پی آفس میں بطور کلرک بھرتی ہو گیا اور ڈھائی 3 سال تک اپنے فرائض ادا کرتا رہا اور اس کے بعد میں سنگولہ کے سکول میں بطور او ٹی ٹیچر تعینات ہو گیا۔ اس وقت آزاد کشمیر میں جماعت اسلامی کا قیام عمل میں نہیں آیا تھا اور میرے جذبات کو مہمیز دینے والا کوئی ساتھی نہیں مل رہا تھا۔ ایک روز مولانا شیر علی مرحوم (دریک راولاکوٹ والے) کے ساتھ میری ملاقات ہو گئی۔

انہوں نے مجھے مولوی نذیر صاحب (پانیولہ) والے سے ملایا وہ مجھے ترجمان القرآن اور مودودی صاحب کا لٹریچر لا کر دیتے تھے اور میں اپنے گاؤں کے روابط میں تقسیم کرتا تھا۔ میں ان دونوں کی محبتوں کا آج بھی قرض دار ہوں۔ جنہوں نے قدم قدم پر میری رانمائی کی اور ساتھ دیا۔اب میں مکمل طور پر تحریک اسلامی کا کارکن بن گیا تھا مولانا مودودی کی عصری محفلوں میں کئی ایک بار اچھرہ میں شرکت کر چکا تھا۔ اب میرا دل لوگوں تک جماعت کا پیغام پہچانے کے لئے مچل رہا تھا۔ دورانِ تدریس میں تنظیم اساتذہ پاکستان کا ممبر بن گیا کیونکہ اس وقت تک آزاد کشمیر میں جماعت اسلامی اور تنظیم اساتذہ کا قیام عمل میں نہیں آیا تھا بہت مشکل حالات تھے جماعت اسلامی کا میں اکیلا کارکن تھا۔ قدم قدم پر اپنوں اور بیگانوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑھتا تھا۔

مرجع خلائق (قسط#2)

افتخار یونس

مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے بارے میں یہاں کے لوگوں کا رویہ نامناسب تھا۔ میں بے یار و مدد گار تھا لیکن اللہ پر کامل یقین تھا کہ وہ میری قدم قدم پر راہنمائی کرے گا کیونکہ جس تحریک کے ساتھ میں وابستہ تھا وہ وہی کام کر رہی تھی جو انبیاء کے ذمہ کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ وابستہ ہونا میرے لئے سعادت سے کم نہ تھا۔ میں ہزار ہا مشکلات کے باوجود ایک قدم بھی اپنے راستے سے پیچھے نہیں ہٹا اور صبر کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا، جن" لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر اس پر ثابت قدم "رہے۔ میرے پیش نظر یہ آیت رہی اور اللہ سے ہر وقت استقامت کی دعا کرتا رہا، اللہ نے مجھے ثابت قدم رکھا۔ 1975ء میں آزاد کشمیر میں جماعت اسلامی کا قیام عمل میں آیا جس کے پہلے امیر مولانا عبدالباری صاحب تھے۔

میں ایک دن راولاکوٹ گندم لینے گیا اس وقت اشیاء خرد و نوش کا سامان زیادہ تر راولاکوٹ سے ہی کندھوں پر ڈال کر لایا جاتا تھا۔ پائیلٹ ہائی سکول کے پاس سے گزر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ طلباء تیزی سے سکول کے اندر جا رہے تھے میں نے ان سے وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا کہ مولانا عبدالباری صاحب آئے ہوئے ہیں۔ یہ سن کر میں بھی ان کے ساتھ اندر چلا گیا۔ مولانا باری صاحب تقریر کر رہے تھے۔ میں بیٹھ گیا اور ان کی پوری تقریر سنی۔ وہ اپنی تقریر میں یہ جملہ استعمال کرتے جماعت" اسلامی یہ کہتی ہے"۔ پھر وہ اگلی بات کرتے:
اس وقت میں اپنے گاؤں میں، میں جماعت اسلامی کا تنہا ممبر تھا۔ بعد میں میرے ایک عزیز انتہائی متحرک محمد شبیر صاحب (بعد میں بطور معلم سکول میں تعینات ہو گئے) کے روپ میں مجھے ایک کارکن مل گیا جس کو میں نے خود سکول میں داخل کرایا تھا۔

مرجع خلائق (قسط#2)

افتخار یونس

انہوں نے مجھے کبھی تنہا نہیں چھوڑا تھا۔ ہر مشکل وقت میں وہ میرے ساتھ ہوتے تھے۔ وہ اسلامی جمعیت طلباء کے امیدوار جماعت اور تنظیم اساتذہ کے رکن رہے ہیں۔ وہ بلا کے ذہین تھے میرے شاگرد تھے لیکن ہر کام میں مجھ سے آگے نکل جاتے تھے میٹرک کے امتحان میں جب انہوں نے علامہ اقبال پر مضمون لکھا تو اس وقت ضیاءاللہ شاہ صاحب نے ان سے پوچھا کہ یہ مضمون کس نے لکھا ہے تو شبیر صاحب نے بتایا کہ میرے استاد محمد یونس صاحب نے لکھا ہے اور میں نے حرف بہ حرف زبانی یاد کر کے لکھ دیا ہے۔ یوں ضیاءاللہ صاحب سے میری دوستی ہو گئی میں ان کے قریب اور وہ میرے قریب آ گئے۔ میں اور محمد شبیر خان جماعت اسلامی کا یہ پیغام لے کر کہ خدا کو خدا اور رسول کو رسول مان کر تمھارے لئے جائز نہیں ہے کہ تم زندگی کے کسی حصے میں ان کے خلاف چلو۔

بلکہ تمہارا فرض ہے کہ پوری زندگی میں اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لئے جان و مال سے جہاد کرو اور یہ کام اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک ہم جمع ہو کر ایک جماعت نہ بن جائیں۔

اس کار رسالت کو ادا کرنے کے لئے جماعت اسلامی بنی ہے۔ یہ محض ایک سیاسی جماعت نہیں ہے جس کی سرگرمیاں انتخابات تک محدود ہوں۔ نہ ایک مذہبی جماعت ہے جس کی دلچسپیاں صرف اعتقادی و فقہی اور روحانی مسائل ہی کے لئے مخصوص ہو۔ بلکہ ہماری ساری جد و جہد کا مقصد صرف ایک ہی ہے کہ ہم اللہ کے مطیع اور فرمابردار بن جائیں اور اسکی رضا اور قرب حاصل کر سکیں۔ یہ رضا اور قربت ایک ایسے ایک انقلاب کے لئے جد و جہد سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ جس کے نتیجے میں دلوں پر بھی اللہ کی حکومت قائم ہو جائےاور پوری زندگی پر بھی۔

مرجع خلائق (قسط#2)

افتخار یونس

پرائیوٹ ہوں یا پبلک، یہ اعلان کہ زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے وہ اللہ کی ملکیت ہے۔ اسی ہمہ گیر انقلاب کی دعوت لے کر ہم نکل پڑھے۔ اس دعوت کے نتیجے میں ہم لوگوں کو کافی حد تک اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

میرا تحریکی ساتھی جو زندگی کے ہر نشیب و فراز میں میرے ساتھ رہا سکول سے رٹائرمنٹ کے کچھ عرصہ بعد داعی اجل کو لبیک کہہ کر مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا ان کا اور مدرس شبیر احمد صاحب کی جدائی کا غم ہمیشہ رہے گا۔ اللہ ان دونوں کو اپنی جنتوں کا مہمان بنائے۔ آمین!

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے

حمزہ تنویر (ایبٹ آبادی)

آج امتِ مسلمہ باوجود اپنی کثرت و افرادی قوت کے طرح طرح کے مصائب و آلام، بے چینی و بے اطمینانی، اخلاقی بے راہ روی و انارکی، معاشی بد حالی، سیاسی ابتری کا شکار ہے، اس کی کئی وجوہات و اسباب ہیں۔

جن میں سے چند چیدہ چیدہ اسباب درج ذیل ہیں:

1) دینِ اسلام سے دوری اور دین کو صرف نماز روزے کی حد تک محدود رکھتے ہوئے یہ سمجھنا کہ دین چند ظاہری عبادت کا نام ہے، حالانکہ دینِ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور تمام شعبہ ہائے زندگی سے متعلق حضور نبی کریم ﷺ کی تعلیمات موجود ہیں۔

2) حضور سرورِ کائنات ﷺ کی سنتوں پہ عمل کرتے ہوئے شرمانا اور یہ باور کروانا کہ لوگ کیا کہیں گے؟ معاشرہ کیا کہے گا؟ اسی حقیقت کو اسعد ملتانی مرحوم نے بڑے ہی پر حکمت انداز میں یوں بیان کیا کہ:

ہنسے جانے سے جب تک تم ڈرو گے
زمانہ تم پہ ہنستا ہی رہے گا
کسی کا آستاں اونچا ہے اتنا
کہ سر جھک کر بھی اونچا ہی رہے گا

حضور کے در پہ سر جھکا لو اور پوری دنیا سے اپنا لوہا منوا لو۔ اس کی زندہ مثالیں تاریخِ اسلام میں حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مبارک صورت میں موجود ہیں، کہ بالکل بے سر و سامانی کی حالت میں دنیا کی مضبوط سے مضبوط تر طاقتوں کو محض اللہ رب العزت کے فضل و کرم اور آپ ﷺ کی تعلیمات و سنتوں پہ عمل پیرا ہوتے ہوئے اسلام کے پرچم کے سامنے سرنگوں ہونے پہ مجبور کرنا اور اپنے اخلاق سے لوگوں کے دلوں میں محبتِ اسلام کا بیج بونا۔

3) اتحاد و اتفاق کا فقدان آج امتِ مسلمہ کا شیرازہ بکھر چکا ہے، اتحاد و اتفاق نام کی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی، ہر ایک اپنے مکتب فکر و طبقہ کے پرچار میں لگا ہوا ہے۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے

حمزہ تنویر (ایبٹ آبادی)

حالانکہ قرآن مجید میں ہے کہ "الفتنة أشد من القتل"

فرقہ واریت نے جس قدر امت مسلمہ کو نقصان پہنچایا ہے اور خصوصا ہمارے وطن عزیز کو اس سے زیادہ کسی چیز نے نقصان نہیں پہنچایا، اور اغیار کی اول دن ہی سے یہ کوشش وسازش رہی ہے کہ امت مسلمہ کبھی متحد نہ ہونے پائے، لہذا اس عدم اتحاد و اتفاق سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ اس نعرہ پہ کاربند رہا جائے، "اپنا مسلک چھوڑو نہیں دوسروں کو چھیڑو نہیں"۔

ہم سب کو آپس میں مل کر اسلام، امت مسلمہ اور اپنے وطنِ عزیز کے لیے متحد ہو کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

4) اپنی بات کو حرفِ آخر سمجھنا۔ آج ہم دوسرے کی صحیح بات بھی صرف اس لیے ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے کہ وہ مخالف گروہ یا فریق کی طرف سے آئی ہے، حالانکہ "خذ ما صفا ودع ما کدر" ہمارے پیش نظر رہنا چاہیے۔

5) ہماری قوم پروپیگنڈے کی عادی ہو چکی ہے۔ اگر کوئی غلط بات بھی پھیلادی جائے تو اس پہ آنکھیں بند کر کے اعتماد کرنا اور بلا تحقیق اسے آگے پھیلانا، یہ درحقیقت قرآن کریم کی اس آیت کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔

"یا یھاالذین امنواان جاء کم فاسق بنباء"

لہذا اس آیت پہ عمل کرتے ہوئے کوئی بات بلا تحقیق آگے نہ بھلائی جائے اور اسے اپنی زندگی کا معمول بنایا جائے۔

6) سودی نظام معیشت جب تک امتِ مسلمہ سودی نظام سے چھٹکارا حاصل نہیں کرے گی، اس وقت تک نہ ہی ترقی کر پائے گی اور نہ ہی معاشرے میں جاری ظلم وفساد کو روک پائے گی، سودی نظام کا لازمی نتیجہ ہے کہ امیر امیر سے امیر تر ہوتا چلا جائے اور غریب غریب سے غریب تر ہوتا چلا جائے، لہذا جب امیر اور غریب کا فرق فطری حد سے تجاوز کرے گا تو اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ ہر ایک اپنا حق وصول کرنے کے لیے جائز ناجائز کی پرواہ کیے بغیر اپنا حق حاصل کرے گا جو باہمی نااتفاقی کی صورت میں نمودار ہو گا۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے

حمزہ تنویر (ایبٹ آبادی)

اللہ رب العزت پوری امتِ مسلمہ کو اتحاد و اتفاق کی دولت سے نوازے اور اتحاد کی صورت میں وقتی کسی کا کوئی نقصان بھی ہو رہا ہو تو اسے محض اللہ رب العزت کی خاطر اس نعمتِ عظمی کے لیے قبول کر لے، اس پہ مرتب ہونے والے فوائد و ثمرات بیش بہا ہیں۔
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر
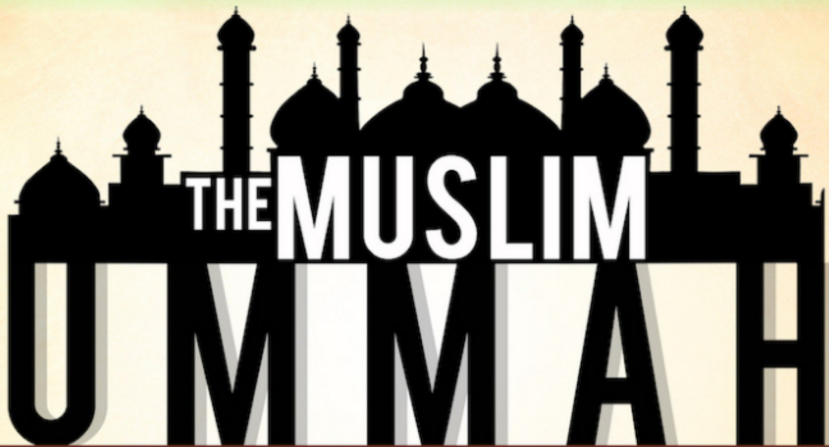
حضرت عمرؓ بحیثیت حکمران

سیدہ فاطمہ طارق

حکمران اس شخص کو کہتے ہیں جس کو اپنی ریاست کے تمام اختیارات حاصل ہوں اور خلافت ایک شرعی اور نیکی کا کام ہے جس سے اللہ کی رضا مندی مقصود ہوتی ہے۔ جو اس منصب پر فائز ہوتا ہے اور اچھے ڈھنگ سے اسے چلاتا ہے، اس کے لیے ثواب کی امید کرتا ہے کہ اللہ کے پاس اسے اس کا بہتر اجر ملے گا کیونکہ وہ احسان کرنے والوں کو ان کے احسان کا بدلہ اور برائی کرنے والوں کو ان کی برائی کا بدلہ دیتا ہے۔

آج ہم بحیثیت حکمران جس ہستی کا تذکرہ کرنے جا رہے ہیں وہ ہیں خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ۔ جب بحیثیت حکمران حضرت عمرؓ منصبِ خلافت پر فائز ہوئے تو آپؓ منبر پر تشریف لائے اور کہا: " اے اللہ! میں سخت ہوں مجھے نرم کردے، میں کمزور ہوں، مجھے قوت دے دے، میں بخیل ہوں، مجھے سخی بنا دے"۔ (مناقبِ امیر المومنین، ابن الجوزی، ص:180/181)

منصبِ خلافت سنبھالنے کے بعد حکومت کا ایسا منشور سامنے آتا ہے جس سے ہٹ کر چلنے کی ادنیٰ گنجائش بھی نہیں ہے۔ آپ کے نظامِ حکومت کے نمایاں خد و خال کچھ اس طرح ہیں:

1) آپ خلافت کو ایک آزمائش سمجھتے تھے کہ اس سے آپ آزمائے گئے ہیں اور یہ کہ اس کے حق کی ادائیگی کے متعلق آپ سے محاسبہ کیا جائے گا۔

2) عمرؓ نے عسکری ادارے کو ترقی دی اور اپنے دور میں وہ ایسا زبردست فوجی ادارہ بنایا کہ پوری دنیا میں اس کی کوئی مثال نہ تھی۔

3) سیدنا عمرؓ نے مالی محکمہ اور مالی خزانہ کو بہت ترقی دی، بیت المال کی آمدنی کے ذرائع اور ملکی مفاد میں اس کے مصارف کو نہایت منظم کیا۔

سیدنا عمرؓ اپنے عدل و انصاف کا نمونہ تھے جس نے دلوں کو فتح کر لیا اور عقلیں حیرت زدہ رہ گئیں۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طرزِ عمل پر چلتے رہے۔

حضرت عمرؓ بحیثیت حکمران

سیدہ فاطمہ طارق

آپ حق پر مضبوطی سے قائم رہنے والے تھے۔ اللہ سے جلد ملاقات پر آپ کا ایمان اس قدر مضبوط تھا کہ ہر کام میں لوگوں کی رضامندی سے پہلے اللہ کی رضامندی کے طالب ہوتے تھے، صرف اللہ سے ڈرتے اور انسانوں میں کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔
آپ نے ایک مسلمان کے خلاف یہودی آدمی کے حق میں عدل وانصاف کے ساتھ فیصلہ کیا، یہودی کے کفر نے آپ کو اس بات پر نہیں ابھارا کہ آپ اس پر ظلم کریں اور عدل سے ہٹ جائیں۔ جب تک سارے مسلمانوں کو کھانا میسر نہ ہوتا آپ خود نہیں کھاتے تھے، آپ ایک دن چھوڑ کر ایک دن روزہ رکھتے تھے۔ (مناقبِ امیر المومنین، ابن الجوزی، ص: 101)
خلفائے راشدین کی حکومتیں جن اہم اصولوں پر قائم تھیں ان میں سے ایک اصول "آزادی" کا بھی تھا۔ اس اصول کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے تمام انسانوں کی ہر طرح کی آزادیوں کی ضمانت لی جائے۔

سیدنا عمرؓ ذمیوں کی غلطیوں سے بہت در گزر کرتے تھے، یہاں تک کہ اگر وہ کبھی جزیہ دینے سے عاجز رہتے تو آپ انہیں معاف کر دیتے۔
اسلام ہر فرد کو اظہار رائے کی آزادی کا مکمل حق دیتا ہے۔ خلفائے راشدین کے دور میں یہ آزادی محفوظ تھی، عمرؓ لوگوں کو موقع دیتے تھے کہ اپنی بہترین آراء بیان کریں۔
عمرؓ بن خطاب نے اپنی خلافت کے ڈھائی سال گزر جانے کے بعد سب سے پہلے اسلامی تاریخ کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے علیؓ بن طالب کے مشورہ سے محرم کی 16 تاریخ کو اسے مقرر کیا۔ (تاریخ الاسلام، الذھبی، ص: 163)
سیدنا ابو بکر صدیقؓ "رسول اللہؐ کے خلیفہ" کہے جاتے تھے، لیکن جب آپ کی وفات ہو گئی تو مسلمانوں نے کہا: بہتر ہے کہ خلیفہ کے لیے کسی نام پر اتفاق کر لیا جائے تاکہ بعد میں آنے والے خلفاء کو بھی اسی سے پکارا جائے۔

حضرت عمرؓ بحیثیت حکمران

سیدہ فاطمہ طارق

چنانچہ بعض صحابہ کرامؓ نے کہا: ہم "مومن" اور عمر "ہمارے امیر" کہے جائیں۔ پھر عمرؓ "امیرالمومنین" کہے جانے لگے اور آپ سب سے پہلے اس نام سے موسوم کیے گئے۔

(الطبقات الکبری، ابن سعد)

عمر فاروقؓ کے ایمان ہی نے آپ کی شخصیت کو بہت بارعب بنا دیا تھا۔ قرآن کے سایہ میں زندگی گزار کر، نبی ﷺ صادق و امین کی صحبت اختیار کر کے اور حیاتِ فانی کا جائزہ لے کر آپ نے بخوبی سمجھ لیا تھا کہ دنیا ابتلاء و آزمائش کا گھر اور آخرت کی کھیتی ہے۔ سیدنا عمرؓ ورع و تقوی کے شیدائی تھے۔ عمرؓ کی تواضع اور آپ کی نگاہ میں فضلاء کا قدر و احترام نمایاں تھا۔ سیدنا عمرؓ عزت و احترام کے بارے میں کسی فضل و سبقت کو نظر انداز نہ کرتے تھے۔ سیدنا عمرؓ نے اپنے گھر والوں کو رفاہ عامہ کے لیے خاص کی گئی ملکیتوں سے استفادہ کرنے سے منع کر دیا تھا۔

سیدنا عمرؓ ازواجِ مطہرات کے حالات معلوم کیا کرتے تھے۔ کوئی میوہ یا پھل کھاتے تو اس میں ازواجِ مطہراتؓ کا حصہ ضرور لگاتے۔

سیدنا عمرؓ مسلمان عورتوں، لڑکیوں اور ضعیف خواتین کی خصوصی دیکھ بھال کرتے تھے، انہیں ان کا حق دیتے اور ان پر کسی طرح کا ظلم نہیں ہونے دیتے تھے۔ جن خاندانوں کے مرد حضرات جہاد پر ہوتے ان کی تمام ضروریات پر نگاہ رکھتے۔

عمر فاروقؓ نے زکوٰۃ پر بھی خصوصی توجہ دی۔ آپ لوگوں کو حج کی رغبت دلاتے اور انہیں اس کا حکم دیتے۔

عمر فاروقؓ بذات خود مسلمانوں کی نگرانی اور پہرہ داری کرتے تھے تاکہ بذاتِ خود ان چیزوں کو دیکھ اور سن سکیں جنھیں بعض اعمال آپ تک پہنچانے میں تردد محسوس کرتے ہیں یا حقیقی صورت حال آپ کے سامنے پیش نہیں کر پاتے۔

سیدہ فاطمہ طارق

جانوروں سے آپ کی شفقت اور رحمدلی صرف ایمان صادق کا نتیجہ تھی۔ آپ کا دل ذکر الٰہی کی وجہ سے نرم ہو چکا تھا۔
اسلام کے شروع دور میں آپ امتِ مسلمہ کے فقیہ تھے۔ علمی مدارس کی تاسیس میں سب سے پہلی اینٹ آپ نے رکھی۔
آپ ایسے تمام علوم کے سیکھنے سکھانے کا اہتمام کرتے جن کا تعلق قرآن اور سنتِ نبوی ﷺ سے ہو، خاص طور سے عربی زبان پر زیادہ ہی توجہ دیتے تھے۔

بے زباں

سونیا ارم

حمنہ! ارے او کمبخت ماری کہاں مر گئی ہے تو؟
فرخندہ کی آواز صبح صبح پورے محلے میں گونج رہی تھی۔
جی خالہ! حمنہ بھاگتی ہوئی آئی۔
"منحوس! کہاں تھی تو، کب سے آوازیں دے رہی ہوں۔
وہ خالہ میں واش روم میں تھی۔ اس لئے دیر ہو گئی۔ کوئی کام تھا کیا؟ حمنہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
یہ دیکھ جھاڑو کیسے لگائی ہے۔ ساری مٹی نظر آ رہی ہے۔ دھیان کہاں ہوتا ہے تیرا "حرام خور"۔
خالہ میں نے جھاڑو لگائی تھی۔ یہ ملائکہ اور ارصم کھیل رہے تھے تو انہوں نے پھیلائی ہے۔حمنہ نے اپنی صفائی دینے کی کوشش کی۔
"بند کر اپنی بکواس میرے معصوم بچوں پہ الزام لگاتی ہے۔ نمک حرام" (فرخندہ کو گالیاں بکنے کی بری عادت تھی) دیکھ میں تیرا کیا حال کرتی ہوں۔
اس نے حمنہ کو مارنا شروع کر دیا۔ حمنہ بے زباں بنی روتی رہی اور مار کھاتی رہی۔ اسے پتا تھا وہ جتنی مزاحمت کرئے گی فرخندہ بیگم اسے اتنا مارے گی۔
دروازے پہ دستک کی آواز سن کر فرخندہ کے ہاتھ رکے تو حمنہ بیچاری نے سکون کا سانس لیا۔ محلے کی خالہ کو دیکھ فرخندہ نے اسے کچن کی صفائی کے لئے بھیج دیا اور خود خالہ سے باتیں کرنے میں لگ گئی۔
حمنہ کچن کی صفائی کرتے ہوئے اپنے نصیب کی اللہ سے شکایت کر رہی تھی۔ نرم گرم آنسو اس کے گالوں کو بھگو رہے تھے۔
حمنہ چار سال کی تھی کہ اس کی ماں کو ڈاکٹر نے کینسر کی تشخیص کی تھی۔ غریب سکینہ محنت مزدوری کر کے اپنا چولہا جلا رہی تھی۔ اپنا علاج کہاں سے کرواتی۔ اس کا نشئی شوہر کوئی کام دھندہ تو کرتا نہ تھا۔

بے زباں

سونیا ارم

الٹا سکینہ کو مار پیٹ کر اس سے پیسے بٹور لیتا۔ بر وقت علاج نہ ہونے کے باعث کینسر پورے جسم میں پھیل گیا اور سکینہ اپنی بیٹی کو روتا بلکتا چھوڑ کر دنیا چھوڑ گئی۔کچھ روز تو محلے والے ان کو کھانا دیتے رہے پھر انہوں نے دینا بند کر دیا۔ حمنہ پانچ سال کی تھی جو دنیا کی بے رحمی سے ناواقف تھی۔ وہ کسی کو اپنی بھوک پیاس کا نہیں بتا سکتی تھی۔ باپ کے سامنے اپنی ماں کے لئے آنسو نہیں بہا سکتی تھی۔ وہ زبان کے ہوتے ہوئے بھی بے زباں بن گئی تھی۔

حمنہ کے باپ نے اب اس کی ماں کی موت کو اپنی روزی روٹی کا ذریعہ بنا لیا۔ وہ روز صبح حمنہ کو ساتھ لے کر سڑک کے کنارے بیٹھ جاتا اور حمنہ کو کہتا کہ وہ لوگوں کو بتائے کہ اس کی ماں مر گئی ہے اور باپ بے چارہ معذور ہے۔ گھر میں کمانے والا کوئی نہیں اللہ کے نام پہ اس کی مدد کریں۔

کچھ لوگ تو حمنہ کو نظر انداز کر کے گزر جاتے اور کچھ لوگ اس معصوم پہ ترس کھا کر اسے دس بیس تھما جاتے جسے شام ہوتے ہی اس کا لالچی باپ اس سے چھین کر نشے میں اڑا دیتا۔ ایک دن فرخندہ بیگم جس کا تعلق "کوٹھے" سے رہ چکا تھا۔ وہ بازار سے سامان لینے گئی تو اس کی نظر حمنہ پہ پڑی۔ حمنہ جو گندے کپڑوں، الجھے بالوں، دھول مٹی سے اٹے ہوئے چہرے کے ساتھ بھی خوبصورت لگ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی اس مکار عورت کے منہ سے رال ٹپکنے لگی۔ کہتے ہیں کہ کچھ لوگ خود کو جتنا بھی بدل لیں مگر ان کی فطرت ان کے اصل کو بدلنے نہیں دیتی۔ فرخندہ کچھ سوچتے ہوئے آگے بڑھی اور اس کے باپ کے آگے ہزار ہزار کے چند نوٹ لہرائے۔ جسے دیکھ وہ کتے کی طرح جھپٹا مگر فرخندہ نے اس کی کوشش کو ناکام کر دیا۔

بے زباں

سونیا ارم

ارے ارے پیسے چاہیے آپ کو، چلیں پھر ایک سودا کرتے ہیں۔ یہ پیسے میں آپ کو دے دوں گئ مگر ان کے بدلے مجھے آپ کی بیٹی چاہیے۔ دیکھیں نا بن ماں کی بچی آپ کیسے سنبھالیں گے اسے۔
فرخندہ کی چال کامیاب ہو گئ۔ حمنہ کے سفاک باپ نے چند پیسوں کے عوض اس کا سودا کر دیا تھا۔
او مہارانی! خوابوں سے نکل کھانا لگا جلدی سے بچوں کو بھوک لگی ہے۔
فرخندہ کی آواز حمنہ کو ماضی سے باہر لائی۔ فرخندہ بیگم نے حمنہ کو بچپن سے ہی گھر کے کاموں پہ لگا دیا تھا۔ اس نے سب کو یہی بتا رکھا تھا کہ وہ ان کے کسی رشتہ دار کی بیٹی ہے جس کے ماں باپ مر چکے ہیں۔
حمنہ کو گھر سے باہر جانے یا کسی کے سامنے آنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔
جہاں عام بچوں کا بچپن کھلونوں اور کتابوں کے سنگ گزرتا ہے۔
وہیں حمنہ کا بچپن برتنوں، جھاڑو اور فرخندہ کی مار کھاتے گزر گیا۔
جوانی کی دہلیز پہ قدم رکھا تو وہ فرخندہ کی سوچ سے بھی بڑھ کر خوبصورت نکلی ایک دن فرخندہ اس کے لئے نہایت خوبصورت کامدار فراک لائی اور اسے پہننے کو کہا۔ حمنہ نے ڈرتے ڈرتے فراک لے لیا۔ جب وہ گلابی فراک پہن کر آئی تو اس کے لمبے کالے بالوں نے اس کی خوبصورتی کو چار چاند لگا دیے تھے۔فرخندہ نے اس کی موبائل میں تصاویر لیں اور اسے کپڑے بدل کر کچن میں جانے کا حکم صادر کرتی کہیں باہر چلی گئی۔
حمنہ پہلی بار اتنے خوبصورت کپڑے پہن کر خوش ہو رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ کپڑے نہیں بلکہ اس کو گناہ کی دلدل میں دھکیلنے کا پھندہ ہے۔ وہ کپڑے بدل کر کام میں مصروف ہو گئی۔

بے زباں

سونیا ارم

شام کو فرخندہ گھر لوٹی تو وہ بہت خوش تھی کیونکہ اس نے اس بے زباں کا دس کروڑ میں سودا کر دیا تھا۔

اگلے روز ایک میک اپ سے سجی سرخ بھڑکیلے رنگ کی ساڑھی زیبِ تن کیے ایک عورت اور ایک آدمی ان کے گھر آئے اور فرخندہ نے حمنہ کو ان کے حوالے کر دیا۔

کوٹھے پہ پہنچتے ہی دو لڑکیاں اسے اپنے ساتھ کمرے میں لے گئی اور سجا کر باہر لے آئی۔ فرخندہ بیگم نے اسے اتنا ٹارچر کیا ہوا تھا کہ وہ اپنی زباں کھولنے کی ہمت ہی نہیں کر پا رہی تھی۔ ایک مجسمہ بنی دیکھ رہی تھی اور پھر ہر روز ایک نیا گاہک اس کی خوبصورتی کا خریدار بن کر اس کی عزت کو تار تار کر دیتا۔

حمنہ ہر روز فریاد کرتی کہ رب کسی بیٹی سے اس کی ماں نہ لینا۔ اگر لے تو اسے میری طرح بے زباں نہیں بلکہ ہمت دینا کہ وہ ظالم دنیا کا مقابلہ کر سکے۔

وادی کشمیر

مقیتہ وسیم

کشمیر کے خوبصورت اور فانوسوں سے بھرے ہال میں بیٹھے چائے پیتے ہوئے، شیشے سے باہر کے مناظر قدرت کا شاہکار لگتے ہیں۔ فطرت اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ موجود تھی۔ نظر جہاں بھی گھمائی جاتی، سبزہ ہی سبزہ تھا۔ ہوٹل سے باہر گھاس کا ایک وسیع سلسلہ پھیلا ہوا تھا جو نظروں کو بہت ہی بھلا لگ رہا تھا۔ چاروں طرف چھوٹی بڑی عمارتیں تھیں، جن کی لال رنگ کی چھتیں اور اوپر کو اٹھے ہوئے کونے بہت ہی دیدہ زیب دکھ رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا گویا ہم جاپان کی کسی وادی میں ہیں۔ ان عمارتوں کے پیچھے دیو ہیکل پہاڑ تھے جو بھاری بھر کم ہونے کے باوجود حسین لگ رہے تھے اور انسان کی ہمت کو چیلنج بھی کر رہے تھے۔ مجھے وہ کوہِ پیما یاد آ گئے جو سخت ترین موسم اور ناکافی سامان ہونے کے باوجود بھی پہاڑوں کے سینوں پر چل چل کر انھیں سر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فلک بوس پہاڑ یقیناً ان کے جذبوں کو ورغلاتے ہوں گے اور تب ہی وہ اپنی جان کی پروا کیے بغیر اس کو فتح کرنے کے لیے نکل پڑتے ہیں۔

سورج ان پہاڑوں پر آخری جلوہ دِکھا کر غروب ہو رہا تھا۔ ہم سے رہا نہ گیا، ہم ہال سے باہر نکلے اور سرسبز گھاس پر ننگے پاؤں چلنے لگے۔ گھاس پر چلتے ہوئے جب ٹھنڈی ہوا نے مجھے چھوا تو پورے جسم میں گدگدی دوڑ گئی۔ میں چاہتی بھی یہی تھی کہ خود کو اس ماحول کا حصہ بنا لوں۔ تازہ ہوا کے جھونکوں کو کوئل و مینا کی آوازوں کی ایک ایک لہر کو، سرسبز گھاس پر جابجا موجود سفید کرسیوں کو ارد گرد لگے سیب اور خوبانی سے لدے درختوں، ان کی شاخوں اور پتوں تک کی خوبصورتی کو اور جھیل کی سطح پر ہلکورے مارتے پانی کو محسوس کروں اور اس ساری دلکشی کو اپنے دل میں اتار کر دِل سے اپنے مالک کا شکر ادا کروں کہ اس نے ہم انسانوں کو دنیا میں ہی جنت جیسی نعمتیں دی ہیں۔

وادی کشمیر

مقیتہ وسیم

میں فطرت کی اس رنگینی میں اس قدر کھوئی کہ آس پاس کی ہر چیز سے بے نیاز ہو گی۔ معلوم نہیں کتنے لمحے میں اس ایک مسحور کن کیفیت میں رہی۔
اس وقت مجھے یہ چیزیں بڑی منفرد لگ رہی تھیں۔ یہاں کی خوبصورتی اور قدرتی پاکیزگی، جس نے مجھے سر سے پاؤں تک سرشار کر دیا تھا۔ میں نے ایک لمبا سانس لے کر تازہ ہوا کو پھیپھڑوں میں اتارا۔
وادیِ نیلم کی سیر و سیاحت پر مشتمل سفر ابھی جاری ہے۔ ہم لوگ شاردہ، کیل، اڑنگ کیل اور تاؤبٹ گھوم پھر کر اس وقت کیرن میں موجود ہیں۔ سڑک کے عین کنارے پر واقع ہوٹل کیرن ریزیڈنسی کے سامنے شور مچاتا دریائے نیلم بہہ رہا ہے جبکہ دریا کے دوسرے کنارے پر موجود پہاڑ اور اس پر بنے گھر انڈین کشمیر (مقبوضہ کشمیر) کا حصہ ہیں اور یوں دریائے نیلم یہاں دونوں اطراف کے کشمیر کے مابین ایل او سی کا کام کر رہا ہے۔

وادیِ نیلم کا شمار پاکستانی کشمیر کی خوبصورت ترین وادیوں میں ہوتا ہے۔ یہ وادی دو تحصیلوں اٹھ مقام اور شاردا پر مشتمل ہے۔ مظفر آباد سے شاردا تک سڑک ٹھیک حالت میں ہے مگر اس سے آگے ٹوٹا پھوٹا، بل کھاتا، کچا، اور کہیں سے پتھریلا جیپ روڈ ہے جو آخری گاؤں تاؤبٹ تک جاتا ہے۔ سیر و سیاحت کے فروغ کی غرض سے وادی کے اہم مقامات بارے الگ الگ مختصر سے تبصرے کرنے کا ارادہ تو ہے تاہم فی الحال اتنا ہی کہوں گی کہ اگر آپ جا بجا حسین و جمیل اور سحر انگیز نظارے دیکھنے کے علاوہ ٹھنڈے میٹھے چشموں، جھاگ اڑاتے شوریدہ پانیوں، اور بلندی سے گرتی آبشاروں کو دیکھنا چاہتے ہیں تو اس وادی سے بہتر مقام شاید ہی کوئی اور ہو۔ پہاڑوں پر برف کی سفید چادر بچھی ہوئی اور نیلے آسمان تلے سبزہ زمین کو چوم رہا ہوتا ہے۔ جھیلوں کا پانی اتنا صاف تھا کہ آسمان کا عکس اس میں نظر آ رہا تھا۔

وادی کشمیر

مقیتہ وسیم

جھیل جیسے آئینہ ہو۔ وہاں کے لوگ بہت مہمان نواز ہیں۔ کشمیری چائے اور کشمیری کھانے بے حد پسند کیے جاتے ہیں۔
شام کو جب سورج غروب ہو رہا تھا، ہم نے دیکھا کیسے سورج کی کرنیں پہاڑوں کو سنہری رنگ میں رنگ رہی تھیں۔ اس منظر نے دل کو چھو لیا۔ کشمیر واقعی جنت کا ٹکڑا ہے۔ اس سفر نے ہمارے دل میں کشمیر کی محبت اور بھی گہری کر دی اور کشمیر کی خوبصورتی ہمیشہ کے لیے ہمارے دل میں بسی رہے گی۔ زمین پر چلنا، سیر و سیاحت کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ رب کی قدرت کا مشاہدہ کر سکیں۔ زمین کی دلکشی، رنگ برنگی کلیاں، خوش نما فضائیں، حسین وادیاں ہمارے دل و دماغ کو تازگی بخش رہی تھی۔ اخلاقی حدود کی پاسداری کے ساتھ سیر و تفریح کرنا قابل تحسین عمل ہے۔

بنجونسہ جھیل آزاد کشمیر کی سیر کے چند مناظر کا ذکر ضروری ہے۔ یہ واقعی بے حد خوبصورت مقام ہے لیکن یہاں کم از کم ایک دو دن رکنا چاہیے۔ ورنہ سفر کی تھکان سے سیاحت کا لطف کم ہو جاتا ہے۔
دوریاں، آزاد کشمیر رتی گلی کی سڑک اتنی خوبصورت اور سبز ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ جنت کی سیر کر رہے ہیں۔ رتی گلی جھیل 3,700 میٹر کی بلندی پر واقع ہے اور کوئی 4x4 جیپوں اور کچھ پیدل سفر کے ذریعے وہاں پہنچ سکتا ہے۔ آپ اس وقت دنیا کے ایک حسین، خوبصورت اور پر فضا مقام پر ہیں۔ آپ کے سامنے قدرت کے بے شمار مناظر موجود ہیں۔ کائنات کی خوبصورتی تخلیقی صلاحیتوں کو مزید بہتر بنانے کیلئے ہوتی ہے۔ دنیا میں جنت کا تصور گر مقصود ہو تو اسکی نظیر وادیِ کشمیر ہے، یہاں کی خوبصورتی کی تو بات ہی الگ ہے۔

وادی کشمیر

مقیتہ وسیم

شہروں میں گرد و غبار، چیں پوں، کچ پچ اور قصبوں کی بدبودار گلیوں میں رہنے والے اس سکون کو کبھی محسوس نہیں کر سکتے۔
کشمیر کے حسن کو سمیٹنا انتہائی مشکل ہے، یہاں کے موسم کی دل فریبی، پہاڑوں کا جلال، آبشاروں کی فراوانی، ندیوں کے نغمات، یہ سب چیزیں ایک نئی دنیا کی سیر کرا دیتی ہیں۔

انٹرنیٹ

مقیتہ وسیم

انٹرنیٹ پر آپ کا رویہ شہد کی مکھی کی طرح ہونا چاہیے، صرف عمدہ باتوں پر توجہ مرکوز کرو، خود بھی استفادہ کرو اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاؤ۔ عام مکھی کی طرح ہر گندی اور صاف چیز پر مت بیٹھو، مبادا دوسروں تک بیماری کے جراثیم منتقل کرنے لگو اور تمہیں اس کا احساس ہی نہ ہو۔ نشر و اشاعت میں بھی محتاط رہو، جن باتوں سے شریعت نے منع کیا ہے انہیں کاپی پیسٹ کرنے سے گریز کرو۔ یہ نیکیوں اور گناہوں کی تجارت ہے۔ تم کیا سودا بیچ رہے ہو اس پر تمہاری گہری نظر رہنی چاہیے۔ یہ آن لائن کی دنیا بڑی عجیب ہے۔ جو دیکھنا ہو دیکھ لیں، جو بننا ہو بن جائیں۔ سب کچھ سچ ہے، سب کچھ ٹھیک ہے۔ ہر کوالٹی، ہر معیار کا مواد موجود ہے۔ آپ کی مرضی ہے تھرڈ کلاس سوچ اور مواد دیکھ لیں، مرضی ہے فرسٹ کلاس اور اچھا مواد دیکھ لیں۔

ایک بات تو طے ہے، کوئی گناہ اکیلا نہیں ہے، اور کوئی نیکی اکیلی نہیں ہے۔ بلکہ انٹرنیٹ کی طرح ہیں۔ ایک گناہ پکڑو، تو پورے کا پورا جال ساتھ آ جاتا ہے۔ ایک نیکی پکڑو تو پورے کا پورا جال ساتھ اٹھ پڑتا ہے۔ گناہ پکڑو یا نیکی اسی طرح کے لنکس کھلنے لگتے ہیں، اسی طرح کی کمرشلز آنے لگتی ہیں، اسی طرح کے لوگوں کی فرینڈ ریکوئسٹس آنے لگتی ہیں۔ کچھ ہی دنوں میں انسان اس گناہ یا نیکی کے پورے جال میں جکڑا جاتا ہے، پھنس جاتا ہے، الجھ جاتا ہے۔ کسی تحریر پر کمنٹ یا اسے شیئر کرنے سے پہلے خوب اچھی طرح بار بار سوچ لیا کرو کہ یہ اللہ کی خوشنودی کا باعث ہے یا ناراضگی کا، کوئی چیز لکھنے سے پہلے ہزار بار سوچو، تم جب لکھتے ہو تو تمہارے فرشتے بھی لکھ رہے ہوتے ہیں اور اس سارے عمل کی نگرانی براہِ راست اللہ تعالیٰ کرتے ہیں۔ انٹرنیٹ ایک بڑی مارکیٹ ہے۔

انٹرنیٹ

مقیتہ وسیم

یہاں کوئی بھی اپنی چیز مفت لے کر نہیں بیٹھا، ہر شخص اپنا سودا کسی نہ کسی عوض پر دینے کا خواہشمند ہے۔ کوئی اپنی چیز کا سودا اخلاق کی قیمت پر کرنا چاہتا ہے تو کسی کو فکری انتشار کی تجارت پسند ہے۔ بعض کا مقصد شہرت اور حب جاہ ہے اور ایسے بھی ہیں جو اپنے تئیں خیر خواہی کا جذبہ رکھتے ہیں۔ اس لیے خریداری سے پہلے سامان کی خوب جانچ پڑتال کر لو۔

غزالہ

نورین خان (پشاور)

جیسے ہی سورج سنہری کرنوں کے ساتھ افق کے پار ڈوب گیا، گاؤں پر اپنی ممتا بھری ایک گرم روشنی اور چمک ڈالتے ہوئے، ہوا سکون اور توقع کے احساس سے متاثر کن ہو کر چل رہی تھی اور پودے ہوا کے نرم نرم جھونکوں سے لہرا رہے تھے۔ دن بھر کی محنت سے تھکے ہوئے گاؤں والے، گاؤں کے ایک بڑے میدان میں جمع ہوتے، ان کے چہرے ڈوبتے سورج کی نرم رنگت سے منور ہوتے اور گاوں کے بوڑھے اور بزرگ وہاں بیٹھ کر اپنے دن بھر کی مصروفیات پر گفتگو کرتے۔ بچے اپنے گلیوں میں گونجتے۔ کھیلتے ان کے قہقہے، دھندلی روشنی میں سورج کی کرنوں کا پیچھا کرتے۔ بوڑھے اپنے برآمدے پر سکون پاتے، اپنی کرسیوں پر ہلکے ہلکے، گزرے دنوں کی یاد تازہ کرتے۔ تازہ پکی ہوئی روٹی کی مہک مقامی گھروں سے اٹھتی ہے، جو راہگیروں کو اپنی طلسماتی خوشبو سے مائل کرتی اور گاوں والوں کا دل تازی تازی روٹی کے لئے مچلتا۔

گاؤں ایسا لگتا تھا جیسے ڈوبتے سورج نے اس کی روح میں نئی زندگی پھونک دی ہو۔ جیسے جیسے مغرب کا وقت قریب آتا، گاؤں والے ایک کڑکتے الاؤ کے گرد جمع ہوتے، ان کے چہرے ٹمٹماتے شعلوں سے چمک اٹھتے۔ کہانیاں بانٹ کے ایک دوسرے کو سنائی جاتی، داستانیں نسل در نسل منتقل ہوئیں اور آج بھی بچے بزرگوں سے مزیدار اور دلچسپ کہانیاں ل سنتے، گاؤں میں شام کا منظر گرمجوشی اور دوستی اور رواداری کا منظر پیش کرتا، ایک ایسا لمحہ جہاں وقت ساکت سا لگتا تھا کہ یہ وقت کبھی نا گزرے اور سب یوں ہی مزے سے بات کریں، کڑکتی الاؤ کے گرد بیٹھے کر گرم گرم چائے پیئں اور مونگ پھلی کھائیں۔ غزالہ کو اپنا گاوں بہت پسند تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے سہلیوں کے ساتھ درختوں کے جھنڈ میں کھیلتی اور جھولا جھولتی، غزالہ کو کھیت کھلیان، پودے، پھول بہت اچھے لگتے تھے۔

غزالہ

نورین خان (پشاور)

وہ ہمیشہ اپنی سہیلی مہناز سے کہتی کہ اللہ پاک نے جو سورج بنایا ہے یہ تمام دنیا کو منور کرتا ہے اور تمام عالم میں اپنی روشنی بکھیرتا ہے۔

اللہ پاک نے چاند ستارے بنائے ہیں جو رات کی اندھیری میں دن کی طرح اجالا کر دیتے ہیں۔ مجھے یہ سب بہت اچھا لگتا ہے۔

اور اس طرح، جیسے ہی سورج اپنی آخری الوداعی، آسمان کو گلابی اور نارنجی رنگوں سے منور کر رہا ہو، گاؤں والے منتشر ہو جائیں گے اور اپنے ساتھ ایک اور سحر انگیز شام کی یادیں لے کر اپنے گھروں کو لوٹ جائیں گے۔

وہ اپنے عاجزانہ ٹھکانوں میں آرام کریں گے اور سو جائیں گے، دل اس خوبصورتی کے لیے تشکر سے بھرے ہوں گے جس نے انھیں گھیر رکھا تھا۔ کیونکہ اس گاؤں میں شام کا وہ منظر جب سورج غروب ہو رہا تھا صرف ایک لمحہ نہیں ہوتا تھا بلکہ ان سادہ خوشیوں کی یاد کا پورا خزانہ ہوتا تھا جس نے زندگی کو واقعی جادوئی بنا دیا تھا۔

غزالہ اپنی عادت کے مطابق شام کے وقت اپنی سہلیوں کیساتھ مگن ہوتی مگر جیسے ہی مغرب کی اذان ہوتی، اس کی تمام سہلیاں گھروں کو لوٹ جاتی مگر غزالہ وہاں درختوں اور پودوں کو پانی دیتی۔ ان میں سے کئی پھول کے پودے، تو غزالہ نے خود اگائے تھے، اس لئے وہ پودوں کا بہت خیال کرتی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں رقص کرنی لگی۔ تھوڑی دیر میں آسمان کالے بادلوں میں چھپ گیا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ غزالہ اس منظر کو فطرت کی رنگین نوائی سمجھ کر مزے لینے لگی کیونکہ اس کو قدرت کی حسین رعنائیوں سے بے حد پیار تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے درختوں کی شاخوں سے، اور ہوا کی پر اسرار سنسناہٹ سے، اور دریا کے بے قابو موجوں سے، دلفریب نغمے اٹھ رہے ہیں۔ اور اس کی روح کو مست کر رہے ہو۔

غزالہ

نورین خان (پشاور)

غزالہ بیٹی موسم ٹھیک نہیں ہے، بارش ہونے والی ہے بٹیا، اور مغرب کا وقت ہے، اس وقت لڑکیاں درختوں کے نیچے کھڑے نہیں ہوتی بٹیا رانی، گھر لوٹ جاؤ، باقی پانی کل دے دینا۔ اور ویسے بھی آج تو پودوں کو قدرتی پانی مل رہا ہے۔ دیکھو بارش برسنی والی ہے۔

جی اچھا کریم کاکا گھر جاتی ہوں۔

آ گئی غزالہ! کتنی بار کہا ہے کہ جوان جہاں لڑکی مغرب کے وقت باہر نہیں نکلتی مگر تم ہو کی میری بات مانتی نہیں، یہ اچھے لچھن نہیں۔ ہمیشہ کی طرح غزالہ کو اپنی دادی سے ڈانٹ سننی پڑی مگر وہ ان سنی کر دیتی۔

اپنے گیلے بالوں کو ڈوپٹے سے خشک کرتے ہوئے بولی اماں، اماں ایک کپ چائے کا مل جائے گا؟

اور ماں ہمیشہ کی طرح گرم گرم چائے اور میٹھی گڑ کی روٹیاں اس کے سامنے رکھ دیتی۔

غزالہ کا بہت ہی نرم دل تھا، ہر کسی کی مدد کرنا اس کو اچھا لگتا تھا۔ غزالہ اپنی ہم عمر ساتھیوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی، اسے قدرت نے عظیم محبت بھرا دل دیا تھا۔ جو ہر کسی کی تکلیف پر تڑپتا، وہ بڑی ذہین اور ملنسار واقع ہوئی تھی۔ اس کے قہقہوں سے اکثر گاوں کی فضا گونج اٹھتی تھی۔

جیسے جیسے دن ڈھلتا ہے، گاؤں والے رات کے کھانے کی تیاری کرنے لگتے ہیں۔ عورتیں رات کا کھانا پکانے میں مصروف ہیں، جبکہ مرد اپنے مویشیوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہوتے ہیں۔ بچے ادھر ادھر بھاگتے، کھیلتے اور ہنستے، سورج کی آخری کرنوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ آج بھی غزالہ ماں کیساتھ کاموں میں مصروف ہو گئیں۔ ہمیشہ کیطرح اس نے آٹا گوندھا اور سبزی کاٹی۔

غزالہ

نورین خان (پشاور)

اماں چولہے میں آگ دہکا لو سبزی کاٹ لی ہے بس لا رہی ہوں۔ جلد پکا لینا مجھے بھوک لگی ہے۔

غزالہ میری بچی سارا دن تم کالج میں پڑھتی ہو، اور شام کو کپڑے سیتی ہو مگر پھر بھی ہمارا گزارہ نہیں ہوتا، جب سے تمھارے والد کا انتقال ہوا ہے ہم پر تو جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ جو رشتہ دار پہلے خیر خبر لیتے تھے وہ بھی اب جان چھڑا کر رستہ بدل لیتے ہیں۔

بس بہو یہ زمانہ ہی ایسا ہے تم کیوں اپنا جی جلا رہی ہو، رب سب خیر کرے گا۔ غزالہ یہ باتیں سن کر پریشان ہو جاتی، کہ میں اکیلے کیسے یہ ذمہ داریاں اٹھاؤں گی۔ اماں گھروں میں کام کاج کر کے زندگی کی گاڑی چلا رہی تھی اور اوپر سے دو دو کھانے والے اور۔ دوسرے دن جب غزالہ پودوں کو پانی دینے کھیتوں میں گئی، تو اس کی سہیلیوں نے اس کا خوش دلی سے استقبال کیا اور اسے جھولے پر بیٹھایا مگر اس وقت غزالہ کا چہرہ اترا ہوا تھا اور اس کی پیشانی سے حزن و ملال کے آثار نمایاں تھے۔

سہلیوں نے بہت پوچھا مگر غزالہ نے جواب نہ دیا۔

ساون کے دن تھے، کالی کالی گھٹاوں کا آسمان پر راج تھا۔ ہلکی ہلکی بوندیں زمین پر گرنے لگی اور زمین کی سوندھی سوندھی خوشبو چارسو پھیل گئی۔ گاؤں کی کھلی فضا اور پھولوں کے پودے اور پیڑ میں جھولا اور شرارتی اور شوخ سہلیوں کا ساتھ تھا۔اچانک تیز طوفانی بارش شروع ہو گئی۔ غزالہ اپنے سہلیوں کیساتھ بارش میں ناچنے لگی۔ اور اس کا لباس پیلے جارجٹ کا ڈوپٹہ اور گہرا نیلے رنگ کا کرتا جو بارش میں مکمل بھیگ چکا۔

دھت رے آج تو میں پودوں کو پانی بھی نہیں دے پاؤں گی، ظاہر ہے بارش جو رہی ہے۔

جیسے ہی مغرب کی اذان سنائی تھی، سب لڑکیاں اپنے گھروں کو لوٹ گئی مگر غزالہ اپنی چیزیں سمیٹ رہی تھی اور بارش کے تھمنے کا انتظار کرنے لگی۔

غزالہ

نورین خان (پشاور)

غزالہ جس کا وجود مکمل بھیگ چکا تھا اور لباس بھی باریک تھا اسے بہت سردی لگنے لگی۔
اچانک غزالہ درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ مغرب کا اندھیرا چھانے لگا۔ جیسے ہی غزالہ اٹھی اور جانے لگی تو اچانک پیچھے سے آواز آئی۔
غزالہ! غزالہ نے طویل سانس لے کر اپنے بالوں سے پانی چھڑکتے ہوئے بولی جی کون؟
پھر سے آواز سنائی دی غزالہ! غزالہ نے پیچھے دیکھا تو کوئی نہ تھا۔ سامنے دیکھا تو میدان خالی تھا اور بارش ہلکی ہلکی ہو رہی تھی۔ غزالہ جلدی جلدی وہاں سے بھاگی اور گھر چلی گئی۔
گھر پہنچتے ہی اسے بہت تیز بخار ہو گیا۔ ساری رات اس کی ماں اس کی پٹیاں کرتی رہی مگر دو دن مسلسل وہ بخار میں تپتی رہی اور تیسرے دن اس کی طبیعت بحال ہوئی تو اپنے معمول کے کاموں میں لگ گئی۔

ایک دن وہ کالج سے گھر آ رہی تھی تو راستے میں اسے ایک بوڑھا آدمی ملا بولا غزالہ بیٹی تم ہو؟
وہ بولی جی میرا ہی نام غزالہ ہے۔
بیٹی یہ لفافہ لو اس میں تمھاری امانت ہے۔
اور یہ کہہ کر وہ بوڑھا آدمی چلا گیا۔
گھر آ کر غزالہ نے لفافہ کھولا تو اس لفافے سے ایسی مسحور کن، مدہوش کن خوشبو محسوس ہوئی جس نے اس کی روح تک کو معطر کر دیا تھا۔
ایک گلاب کا پھول تھا اور پورے تیس ہزار روپے تھے۔ ایک ساتھ اتنے بڑی رقم دیکھ غزالہ بہت حیران ہوئی مگر سوچنے لگی چلو اچھا ہوا، اس سے ہماری گزر بسر تھوڑی آسان ہو جائے گی۔
اس نے وہ سارے روپے الماری میں سنبھال کے رکھے اور کچھ سے گھر کا سودہ سلف، راشن وغیرہ خریدا اور اپنے قرضے چکائے۔

غزالہ

نورین خان (پشاور)

گاؤں کا ماحول بہت اچھا تھا۔ ساون کے دن تھے۔ راتوں میں تھکے ہارے بوڑھے، بچے اور جوان گلیوں میں چارپائی رکھ کے بیٹھ جاتے اور گپ شپ لگاتے۔ دن بھر کی مصروفیات پر بحث اور تبادلہ خیال کرتے رہتے۔ ساتھ ساتھ گرم قہوے اور قصے کہانیوں کے دور چلتے۔
اس زمانے میں خواتین اور گھر کی عورتوں کے لئے صرف ریڈیو ہی تفریح کا واحد ذریعہ تھا۔ کھانا پکاتے ہوئے یا گھر کے کام کاج کے دوران غزالہ ریڈیو آن کر دیتی تھی۔ اپنے گھر کی کاموں سے فارغ ہونے کے بعد غزالہ کو لگا کہ پچھلے دو دنوں سے وہ درختوں کو پانی دینے نہیں گئی، اس کو بہت بے چینی محسوس ہو رہی تھی مگر اس نے سوچا آج تو جاؤں گی، مگر شام کا وقت نکل چکا تھا اور مغرب کی اذان ہونے والی تھی۔
غزالہ نے دادی سے بہانہ بنایا، کہ مہناز کے گھر کام ہے، ابھی واپس آتی ہوں اور گھر سے نکل گئی۔

درختوں کے پاس پہنچ گئی اور پانی برتن میں ڈالنے لگی اچانک اسے بہت تیز خوشبو محسوس ہوئی مگر اس نے اتنا دھیان نہیں دیا۔
غزالہ! غزالہ تم دو دنوں سے کیوں نہیں آئی۔
میں بہت بے چین تھا، تڑپ رہا تھا۔
غزالہ ایک دم ڈر گئی۔
یا خدا یہ آواز کس کی ہے اور ڈر کے مارے جتنی سورتیں اسے یاد تھی پڑھ ڈالیں۔
اچانک قہقہے کی آواز سنائی دی، ارے پگلی آیت الکرسی بھی پڑھ لو میں بھی مسلمان ہوں الحمدللہ اور میں تو قرآن کا حافظ ہوں۔
اچانک کوئی سورہ رحمٰن کی تلاوت کرنے لگا اور ایسے مدہوش کن اور دلفریب آواز میں تلاوت کر رہا تھا جیسے کانوں میں شہد گھول رہا ہو، اس کی تلاوت سے اس کی روح جیسے تر و تازہ ہو رہی تھی۔

غزالہ

نورین خان (پشاور)

ارے پگلی تم نے چند سورتیں پڑھی ہیں میں تمھیں پورا قرآن سنا سکتا ہوں۔
غزالہ پھر سے ڈر گئی۔ یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ مگر اسے کچھ نظر نہ آیا اس نے دیکھا کہ درخت کے نیچے ایک تھیلا پڑا تھا اس میں رنگ رنگ کے خوبصورت کپڑے اور ریشمی ڈوپٹے پڑے ہوئے جو نہ کسی نے دیکھے ہوں گے نہ خریدے ہوں گے۔
غزالہ وہ تھیلا اٹھا کر گھر جانے لگی ساتھ ساتھ آیت الکرسی پڑھ کر خود پر پھونکتی گئی اور خیریت سے گھر پہنچ گئی اس نے اس واقعے کا کسی سے ذکر نہ کیا۔
ایک دن اماں پڑوس کے گھر گئی ہوئی تھی اور دادی کمرے میں سو رہی تھی۔ غزالہ نے گھر کے کام نمٹا لئے اور کپڑے بدلنے کے بعد، اپنی من پسند جگہ جانے لگی ان درختوں میں بیری کا ایک بڑا اور گھنا درخت غزالہ کو ہمیشہ سے بہت اچھا لگتا تھا اور بیری کے درخت کے اوپر آنے والے پرندوں کوئل، مینا، کوئے، طوطے اور چڑیا، کبوتر اور فاختہ وغیرہ آکر بیٹھ جایا کرتے تھے۔

اور غزالہ ان پرندوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھی۔ غزالہ جیسے ہی وہاں گئی، سب پودوں کو پانی دینے کے بعد بیری کے درخت کے نیچے کالج کی کتابیں نکالی اور پڑھنے لگی۔
اچانک اسے آواز سنائی تھی۔ غزالہ! غزالہ! تم آ گئی۔
آج غزالہ کو ڈر نہیں لگ رہا تھا اس نے بے خوفی سے جواب دیا۔ ہاں میں آ گئی ہوں مگر تم کون ہو؟ مجھے نظر کیوں نہیں آتے؟
غزالہ میری بات سنو۔ کل تم قریبی سکول جاؤ وہاں تمھاری نوکری لگ چکی ہے۔ کیا کیا، نوکری؟
ہاں تم شام کے وقت اب بچوں کو پڑھاؤ گی اور تمھاری مشکلات حل ہو جائیں گی۔
یہ سن کر غزالہ بہت حیران ہوئی کہ نجانے یہ آواز کس کی ہے؟
کون ہے؟ ان سوالوں میں وہ الجھی ہوئی تھی۔

غزالہ

نورین خان (پشاور)

مگراس کو یہ اندازہ ہوا کہ جو کوئی بھی ہے، کم از کم مجھے نقصان نہیں پہچا رہا۔ اس بات پر غزالہ بہت مطمئن تھی اور کسی سے ذکر نہیں کرتی تھی۔

دوسرے دن غزالہ قریبی سکول گئی تو اس کی پرنسپل نے کہا کہ مس غزالہ آپ کی درخواست تو کب کی ہمیں مل چکی ہے اور آپ کی نوکری پکی ہے، اب آپ کو ہر مہینے سرکار سے دس ہزار روپے ماہانہ تنخواہ ملی گی۔ صبح کے وقت رانی، شیازیہ بچوں کو پڑھاتی ہیں اور شام کے وقت تمھاری ڈیوٹی ہو گی۔

غزالہ بہت زیادہ خوش ہوئی اور راستے میں مٹھائی والے سے ڈھیر ساری مٹھائی خریدی اور گھر میں دادی اور ماں کو خوش خبری سنا دی۔ سب نے خدا کا شکر ادا کیا۔

غزالہ نے مٹھائی کا ایک ڈبہ اپنے بیگ میں رکھا اور شام کو بیری کے درخت کے پاس گئی۔ گاؤں کی ساری لڑکیاں گھروں کو لوٹ چکی تھی۔ کسان گھروں کو واپس جا رہے تھے۔ مغرب کا اندھیرا دھیرے دھیرے چھانے لگا۔

غزالہ بیری کے درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ غزالہ! غزالہ تم آ گئی۔ آہ میری روح شاد ہو گئی۔

اچانک غزالہ کے بال ہوا میں لہرانے لگے جیسے تیز ہوا کا جھونکا چھو گیا ہو۔ ہاں میں آ گئی ہوں اور یہ دیکھو تمھارے لئے مٹھائی لائی ہوں۔

کیا کہا مٹھائی، یہ سن کر وہ آواز بہت خوش ہوئی اور جواب دیا تم جانتی ہو کہ مجھے مٹھائی بہت پسند ہے۔

اچانک اس کے سامنے سفید لباس میں ایک لڑکا نمودار ہوا جس کا قد کافی بلند تھا اور اس کی نیلی نیلی حسین آنکھیں تھی جیسے گہرا نیلا سمندر ہو۔

اتنا حسین اور خوبرو لڑکا آج تک غزالہ نے نہیں دیکھا تھا اپنی پوری زندگی میں۔

غزالہ اس کو دیکھ کے بولی اچھا تو تم ہو میرے محسن؟

ہاں میں ہوں۔

غزالہ

نورین خان (پشاور)

میں نے ہی تمھیں روپے بھجوائے تھے اور میں نے ہی تمھاری مدد کی کیونکہ میں تم سے بے انتہا محبت کرتا ہوں۔ بہت زیادہ محبت کرتا ہوں۔
مگر میں نے تو تمھیں کبھی گاؤں میں نہیں دیکھا؟ میری غزالہ! میں گاؤں میں نہیں رہتا۔
میرا نام جعفر جن ہے۔ میں قبیلہ جنات سے ہوں۔ اس دن میں تھکا ہوا تھا اور اس بیری پر آرام کر رہا کہ تم ان درختوں اور پودوں کو پانی دے رہی تھی۔ مجھے تمھاری یہ نیکی بہت پسند آگئی اور اب روز تمھارا یہی انتظار کرتا ہوں۔
میں تمھیں نقصان نہیں پہنچانا چاہتا اس لئے میں تمھارے جسم میں داخل بھی نہیں ہوتا کہ اس سے تمھارے وجود کو تکلیف اور درد ملے گا۔ جعفر جن تم واقعی بہت عظیم ہو۔
مجھے تم پر فخر ہے۔ غزالہ نے کہا کیا تم مجھ سے شادی کرو گے؟ جعفر جن نے کہا ہاں ضرور کرتا شادی مگر۔ مگر کیا؟
مگر میں مسلمان جن ہوں حضرت محمد ﷺ کے امت میں سے ہوں اور میں زبردستی شادی کے حق میں نہیں ہوں کیونکہ تم آدم آزاد ہو۔ اس لئے میری طرف سے تم مکمل آزاد ہو۔ میں بس تمھاری روح سے محبت کرتا رہوں گا۔
تم کبھی کبھی درود شریف اور تسبیح پڑھ کر میری روح کو بخش دینا۔
میں ہمیشہ تمھیں دعا دیتا رہوں گا۔
اب تم اپنی زندگی میں کامیاب ہو اپنے پیروں پر کھڑی ہو اور اسی طرح رب العالمین کی مخلوق کی بے لوث مدد کرنا کیونکہ ہم نیک اور شریف لوگوں کے پاس خود بخود آتے ہیں۔
اب تم گھر جا سکتی ہو اور آج کے بعد میں تمھیں نظر نہیں آؤں گا۔
غزالہ کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو تھے اور وہ شکریہ بھرے نظروں سے اسے جاتا ہوا دیکھ رہی تھی اور جعفر جن غائب ہو گیا۔
محبت امر ہوتی ہے مرتی نہیں۔ غزالہ روتے ہوئے گھر کی جانب روانہ ہوئی۔

نونہالانِ قوم

سائرہ حمید تشنہ (لاہور)

والدین اور لائحہ عمل:
اعلیٰ یا مثبت یا اچھی زندگی گزارنے کے لئے اعلیٰ یا مثبت طریقوں پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے اور ان طریقوں کی پہچان ضمیر کی چبھن سے آزاد طریقے ہیں۔ زندگی تو غیر انسانی مخلوقات بھی گزار رہی ہیں لیکن ان کی اور اشرف المخلوقات کی زندگی میں زمین و آسمانوں کا فرق ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیے۔ اعلیٰ زندگی گزارنے کے لیے ارادے سے اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا از حد ضروری ہوتا ہے۔ اگر کسی قوم کے پاس بامقصد زندگی گزارنے کے لیے کوئی لائحہ عمل ہے تو وہ خوش قسمت ترین قوم ہوتی ہے اور اسے اعلیٰ انسانی اوصاف سے مزین زندگی گزارنے کے اصول و ضوابط بتانے کی ضرورت نہیں ہوتی اور اگر کوئی قوم زندگی کا اعلیٰ نصب العین رکھے لیکن اسے پسِ پشت ڈال دے اور اپنی ہی خرمستیوں میں ڈوبتی چلی جائے تو روئے زمین پر اس سے بڑھ کر بد قسمت قوم کوئی اور نہیں ہو سکتی۔

ذہن کو مثبت سوچوں کا گھر بنانے کے لیے بہترین وقت بچپن کا دور ہوتا ہے جس کی براہِ راست ذمہ داری ماں باپ پر عائد ہوتی ہے۔
اگر ہم اپنے بچوں کی تربیت، من حیث القوم، گھریلو مالی تنگیوں کا رونا روتے ہوئے کریں گے تو انہیں صرف اور صرف اپنے گھر کی ہی فکر ہو گی اور جہاں کہیں بھی انہیں اپنے یا گھریلو فائدے کی کوئی چیز نظر آئی، دل للچائے گا اسے حاصل کرنے کو اگر پیسہ نہیں تو بتدریج چھوٹی چھوٹی چوریوں سے لے کر بڑے بڑے ڈاکوں تک بات جا سکتی ہے۔
اور اگر ہم ملک کی تنگیوں اور ضرورتوں کے اظہار کے ساتھ بچوں کی تربیت کریں گے مثلاً اگر ہم یوں کہیں کہ "بیٹا، بیٹی، کمرے میں کوئی ہے؟" "نہیں"، تو بچو، بتی بند کر کے آیا کریں، فالتو بتی نہیں جلاتے، ایک تو ملک کا نقصان ہوتا ہے دوسرا اللہ بھی ناراض ہوتا ہے"۔ "بچو! جب کمرے سے باہر آئیں تو پنکھا، بلب وغیرہ کھلا چھوڑ کے نہیں آنا، ہمارے ملک میں بجلی بہت کم ہوتی ہے کفایت سے کام لینا چاہیے"۔

نونہالانِ قوم

سائرہ حمید تشنہ (لاہور)

پیارے بچو! اللہ پاک نے ہمیں جو نعمتیں دی ہیں، پانی، انواع واقسام کے کھانے اور بے شمار، بے بہا، نعمتیں انہیں سوچ سمجھ کر استعمال کیا کریں۔ مبادا ہم فضول خرچی سے ملک کے ساتھ ساتھ اللہ کے دوسرے بندوں کی ضرورتوں کو نقصان پہچائیں اور خدانخواستہ اللہ کو ناراض کر دیں"۔

(یہ ہم بڑوں کی ذمہ داری ہے، اللہ پاک نے چھوٹوں کو ہمارے ماتحت کر کے ان کا نگران مقرر کیا ہے جس کا وہ جواب بھی طلب کرے گا۔)

اگر وطنی سوچ کے تحت بچوں کی تربیت کریں تو وہ قدرتی طور پر وطن کے لیے فکر مند ہوں گے، اسی کے لیے سوچیں گے اور ان شاءاللہ تعالیٰ، اس سوچ کے ساتھ پروان چڑھیں گے، وہ جس طرح گھر کے لیے پریشان ہوتے تھے وطن کے لیے بھی ہوں گے۔ ملک میں جب چہار جانب ایک وطن پرور ماحول بن جائے گا، چوریوں کے باعث ادارے تباہ نہیں ہوں گے، ہر کام کرنے والا ایمان داری سے روزگار کمائے گا۔

ایک دوسرے کا احساس ہو گا تو کوئی وجہ نہیں کہ ملک خوشحال نہ ہو، جب اس کے لوٹنے والوں کا، ہماری کوشش اور اللہ کی مہربانی سے، خاتمہ ہو جائے گا تو وطن عزیز میں خوشحالی اور امن و سکون کا دور دورہ شروع ہو گا۔

"اور ہر جان دیکھے کہ اس نے کل کے لئے کیا آگے بھیجا۔" (الحشر، 18)

اور تربیت کے سلسلے میں باپ اس اہم ترین ذمہ داری سے مستثنیٰ تو نہیں ہیں البتہ ماؤں کی ذمہ داری فزوں تر ہے کیونکہ بچے ماؤں سے زیادہ جذباتی وابستگی رکھتے ہیں اور اکثر ماؤں کے پاس وقت بھی زیادہ ہوتا ہے۔ ہاں، اس بات کا خاص خیال رہے کہ ہر وقت وطن وطن کی گردان نہیں کرنی چاہیے، اس سے بچوں کے چڑ چڑا ہونے کا خطرہ بھی ہو سکتا ہے۔ بلا شبہ ہم سب کو اپنے پیارے وطن پاکستان سے بے انتہا محبت ہے لیکن ترقی یافتہ ملکوں کی طرح ہم پاکستان کی وہ خدمت نہیں کر رہے جس کا وہ مستحق ہے۔

نونہالانِ قوم

سائرہ حمید تشنہ (لاہور)

پیارے وطن کو بھی اپنی عزت و آبرو اور باعزت خوشحالی و بقاء کے لیے ہم سب کی طرف سے مذکورہ توجہ کی اشد ضرورت ہے۔
'حق بحق دار رسید' کے مطابق آیئے، بسم اللہ، اپنے سے کریں اور پھر اپنے گھر کے نونہالوں سے، ہمیں شروع میں وطنی سوچ کے تحت تربیت کرنا کافی عجیب لگے گا کیونکہ ہم نے اس سوچ کے تحت کبھی وطن کا نام لیا ہی نہیں، عجیب تو لگے گا ہی لیکن اگر ہم نے اپنی سوچ کے زاویے کو صحیح اور غلط، ایمان و کفر کے پیمانے پر رکھا تو تربیت کا مفہوم سمجھنے اور اس پر عمل کرنے میں آسانی ہو گی اور وطن کے ہم سے، جو بجا طور پر، گلے شکوے ہیں، دور ہو جائیں گے۔
وما علینا الا البلاغ المبین

زندگی اک سراب

فائزہ صابر

فریب ایک ایسی چیز ہے جس سے ہر انسان بچنا چاہتا ہے اور اگر کسی شخص کے ساتھ فریب ہو جاتا ہے تو اس شخص کے منہ سے ہمیشہ یہ ہی سننے کو ملتا ہے کہ کاش! مجھے پہلے پتا ہوتا تو میں اس نقصان سے بچ جاتا۔ یہ کاش پھر بہت اذیت ناک ہوتا ہے کیونکہ پھر اس کی بھرپائی نہیں ہو سکتی، نہ ہی وہ چیز پہلے جیسی ہو سکتی ہے۔ تو کیا آپ جانتے ہیں کہ ہماری زندگی کا سب سے بڑا فریب کیا ہے، وہ کون سا ایسا فریب ہے جس میں ہم پڑ چکے ہیں اور اگر جلدی ہم اس فریب سے نہ نکلے تو ہمارے لبوں سے بھی وہ اذیت ناک کاش نکل سکتا ہے جس کی تاب شاید ہم میں سے کوئی نہ لا سکے۔ تو ہماری زندگی کا سب سے بڑا فریب پتا ہے کیا ہے؟ یہ جان کر شاید آپ ورطۂ حیرت میں ڈوب جائیں کہ ہماری زندگی کا سب سے بڑا فریب خود "زندگی" ہی ہے۔ جی ہاں یہ زندگی ہی سب سے بڑا فریب، سب سے بڑا دھوکا ہے۔ باخدا یہ حقیقت بہت تکلیف دہ ہے کہ ہماری زندگی ہی ہماری سب سے بڑی آزمائش ہے۔

یہ میں نہیں کہہ رہی بلکہ اس زندگی کو عطا کرنے والا دو جہانوں کا رب، آپ کا اور میرا تخلیق کار فرما رہا ہے کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے "اور دنیا کی زندگی سوائے فریب کے کچھ نہیں"۔ (آلِ عمران)

لیکن عصرِ حاضر میں انسان اپنی خواہشاتِ نفس کی تسکین کے لیے اس اٹل حقیقت کو بالکل فراموش کر چکا ہے۔ اسے یاد ہی نہیں کہ وہ تو اس دنیا میں آزمائے جانے کے لیے آیا تھا۔ اس کا تو مقصدِ حیات ہی اللہ کی عبادت کرنا تھا۔ اسے تو اس دنیا میں بھیجا ہی آخرت کی تیاری کے لئے گیا ہے۔ لیکن نادان انسان نے اس دنیا کو ہی حقیقی دنیا سمجھ لیا اور اس کی رنگینیوں میں، اس کی چمک دھمک میں کھو کر اپنے مقصدِ حیات کو ہی بھول بیٹھا۔ آج ہم نے اپنی ہر چیز کے لیے پہلے سے ہی منصوبہ بندی کر رکھی ہے۔ حتیٰ کہ لوگ اپنے مرنے سے پہلے اپنی بیمہ پالیساں بنوا لیتے ہیں لیکن آخرت کی پالیسی کسی کو یاد نہیں رہتی۔

زندگی اک سراب

فائزہ صابر

ہم دنیا میں اس قدر کھو چکے ہیں کہ ہمیں اپنی آخرت کی کوئی فکر ہی نہیں۔ ہم اپنے مستقبل کو سنوارنے میں اس قدر مگن ہیں کہ ہم فرمان الٰہی کو ہی بھول بیٹھے ہیں اور زندگی کے فریب میں پڑتے چلے جا رہے ہیں، زندگی کی ریس میں اتنے تیز دوڑ رہے ہیں جیسے پیاسا صحرا میں پانی کو دیکھ کر اس کی طرف دوڑتا ہے لیکن آخر میں جب حقیقت اس پر آشکار ہوتی ہے تو سوائے پچھتاوے کے اس کے پاس کچھ نہیں رہتا اور نتیجہ یوں ہوتا ہے کہ وہ راستے سے ہی بھٹک جاتا ہے۔ ہماری زندگی میں بھی ایسے بہت سے سراب ہیں جن کے پیچھے ہم بھاگ رہے ہیں، نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں لیکن ان سب میں ہم بہت سی چیزیں کھو دیتے ہیں، بہت سے لوگوں سے دور ہو جاتے ہیں، رشتوں کی قدر کھو دیتے ہیں۔ بس خود کو نفس کا غلام بنا لیتے ہیں۔ اپنی باگ ڈور نفس کے ہاتھوں میں تھما دیتے ہیں جس کا سوار شیطان ہوتا ہے اور پھر وہ ہمیں گمراہی، بربادی، رسوائی اور ظلمت کی عمیق گہرائیوں میں دھکیل دیتا ہے۔

اس سراب کے پیچھے بھاگتے بھاگتے ہم اتنا آگے نکل چکے ہوتے ہیں کہ موت آگے کھڑی ہمارا انتظار کر رہی ہوتی ہے اور پھر جب حقیقت ہم پر آشکار ہوتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ وہ زندگی جو ہم نے گزاری، وہ تو صرف ایک دھوکا تھا، وہ تو ایک سراب تھا، پھر ہمارے پاس سوائے ندامت کے اور کچھ نہیں ہوتا اور ہر طرف اندھیرے ہی اندھیرے ہوتے ہیں، وہ اندھیرے کہ جس میں ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کو سجھائی نہ دے لیکن ابھی ہمارے پاس وقت ہے، ہمیں اپنے آپ کو اس سراب کے پیچھے بھاگنے سے روکنا ہو گا، نفس کی غلامی سے خود کو آزاد کروانا ہو گا اور خود اس پر حکومت کرنی ہو گی۔ جبھی ہم دنیا و آخرت میں کامیاب ہوں گے۔

میں بیزار نہیں ہوں

محمد فرید فریاد (بہار، انڈیا)

ہر شے کو ابتدا میں مشکل مراحل سے گزرنا ہوتا ہے۔ جب انسان کھیت سے اللہ کی عطا کردہ بہترین اناج کو اپنے گھر لاتا ہے تو دیکھنے والے بہت خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھو کسان کا اناج کتنا عمدہ ہے لیکن اس عمدگی کے پیچھے ایک لمبا سفر ہوتا ہے۔ پہلے کسان کھیتوں میں ہل چلاتا ہے پھر بیج بوتا ہے اتنا ہی پر بس نہیں اس کی رکھوالی کرتا ہے۔ اس اثنا میں لوگ اسے کہتے ہیں ابھی بیج مت لگاؤ بارش نہیں ہوگی یا جانور ساری فصل برباد کر دیں گے لیکن وہ ان باتوں سے بے نیاز جہدِ مسلسل کرتا رہتا ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اس کی کامیابیوں کے چرچے ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح میرے حساب سے اس سے کہیں زیادہ کھٹن راہوں سے نئے لکھنے والوں کو گذرنا پڑتا ہے جب وہ اپنی پہلی تحریر اپنے بڑوں کو دکھاتا ہے تو وہ اسے لکھنے کے اصول وضوابط سمجھانے لگتے ہیں۔ اگر پہلی غزل بڑے شاعر کی خدمت میں پیش کرتا ہے تو وزن و بحر پر لمبی بحث لا کر اس کے پروان چڑھتے جذبے کو مارنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اور بسا اوقات بہترین تخلیقی صلاحیت کے افراد ان مباحثوں سے دل برداشتہ ہو کر لکھنا چھوڑ دیتے ہیں لیکن اگر میں اپنی بات کروں تو میں ان باتوں سے متاثر نہیں ہوا کیونکہ ہمارے دوست و احباب اور جاننے والوں نے اپنے قیمتی اوقات میں سے چند لمحے بھی مجھے دینا گوارہ نہیں سمجھا تو بھی میں لکھتا رہا اور یہی کوشش ایک انجان شخص کو بھا گئی اور انہوں نے رہنمائی شروع کی اور ہمارے کچھ مشفق و مربی اساتذہ کی سرپرستی حاصل ہے۔ ان کی حوصلہ افزائی سے ٹوٹی پھوٹی تحریر میں لکھنا سیکھ رہا ہوں۔ میں بھی نو آموز ہوں اور اپنے تمام نو آموز دوستوں سے گزارش کرتا ہوں کہ آپ دوسروں کے طعن و تشنیع سے بالکل دل برداشتہ نہ ہوں۔ کیونکہ کوئی اپنی ماں کے پیٹ سے سیکھ کر نہیں آتا، کثرتِ مطالعہ اور جہدِ مسلسل ہی اسے اچھا لکھاری بناتا ہے۔ لہٰذا آپ بھی مطالعہ کی عادت ڈالیں اور روانہ کچھ نہ کچھ لکھا کریں۔

لکھنے میں ڈر کیسا

نسیم الاسلام

قلم لکھتا ہے جو چاہو لکھے گا۔ بس اس کو استعمال میں لا کر خوف زدہ نہیں ہونا کہ میں کیا لکھوں؟ جو لکھوں وہ کہیں غلط نہ لکھا جائے، لکھتے لکھتے کہیں کچھ ایسا نہ لکھ ڈالوں جو لوگوں کی دلچسپی کی داد نہ رکھے۔ تو اس میں سب سے پہلی بات یہ آتی ہے کہ کیا آپ اپنے قلم کو جس کے ذریعے آپ! اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں، محض اس لیے خاطر میں نہیں لاتے کہ میں اغلاط کا ڈھیر نہ لگا دوں، پھر بھول جایئے کہ آپ کبھی اچھا لکھ سکتے ہیں۔ بھاگنے والا گر کر سنبھلتا ہے تو لکھنے والا غلطیوں سے سیکھتا ہے۔ اس لیے گھبرایئے نہیں اور لکھتے جایئے اچھا لکھنے واسطے یہ ضروری ہے کہ آپ لکھتے جائیں، لکھتے جائیں حتیٰ کہ آپ کی تحریر میں رعنائی شامل ہو جائے۔

اور آخر میں میرا ایک سوال یہ ہے کہ کیا آپ اپنے قلم سے پروئی تحریر کو لوگوں کی داد طلبی کی خاطر استعمال میں لاتے ہیں؟ یا اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کی بھلائی کے لیے اپنی تحریر کو خاطر میں لاتے ہیں؟ اگر تو آپ عوام کو نمائش واسطے اپنے قلم کی تحریر پیش کرتے ہیں تو یہ جان لیں کہ آپ کے قلم کا ذائقہ پھیکا ہونے والا ہے اس میں مٹھاس ختم ہونے والی ہے کیونکہ قلم اپنی تاثیر تبھی کھوتا ہے جب وہ محض داد طلبی پر اتر آئے۔ اب رہی بات قلم کی تحریر کو بھلائی کے لیے استعمال میں لانے کی تو یہ جان لیں کہ پھر بہت کچھ ایسا ہے جو آپ کی تحریر کا حصہ بننے والا ہے اس میں محض قلم اٹھانے کی دیر اور دوری ہے۔ جو آپ کو اوج کمال تک پہنچا سکتی ہے۔

اے مسلمانو، گونگوں، بے زبانوں تم کہاں ہو؟

یاسمین ناز

اہلِ اسلام کو اہلِ غزہ کی جانب سے ایک درد بھرا پیغام جسے سن کے انسان تو انسان حیوان بھی رو رہے ہیں۔ ان کا ایک ہی سوال ہے کہ اے مسلمانو اگر تم زندہ ہو تو اپنے زندہ ہونے کا کچھ ثبوت تو دو۔
اے اسلام کے نام لیواو ہمیں پوری دنیا کی یہودیت مل کر قتل کر رہی ہے۔ ہمارے گھر تباہ کر دیے ہیں، ہمارے خاندانوں کے خاندان اجڑ گئے ہیں، سفاکیت کی انتہا یہ ہی کہ ہمیں پانی تک نہیں دیا جا رہا۔ ہمارے رہنے کے لیے گھر نہیں۔
او مسلمانو او دیکھو تو سہی ہمارے ساتھ دنیائے کفر کس قدر سنگین ظلم و ستم کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ ایسا ستم کہ جس کو دیکھ کر فلک بھی اشکبار ہے مگر آپ مسلمان ہو کہ صرف تماشائی بنے ہوئے۔ یہ سب منظر اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔
او مسلمانوں او اسلامی ملکوں کی افواج، او اندھو بہرو گونگوں ایک بار آؤ تو سہی ہماری مسجدِ اقصیٰ کے گنبد گرائے جا رہے ہیں جو ہمارا اور آپ کا قبلۂ اول ہے۔
اس کا تحفظ تو آپ سب مسلمانوں کا فرض ہے۔ اہلِ اسلام اگر مسلمان ہیں کچھ تو اپنے مسلمان ہونے کا ثبوت دیں۔ ایک طرف ہماری گردنیں کٹ رہی، ہماری عزتیں نیلام کی جا رہی ہیں، ہماری بیٹیاں صیہونی طاقتوں کے ہاتھوں برباد ہو رہی ہیں اور آپ اتنے آرام سے یہ منظر میچ کی طرح دیکھنے میں مصروف ہیں۔
اے اہلِ اسلام کیا آپ سب کو یہ منظر ڈرامہ لگ رہا ہے؟ اہلِ اسلام آپ کی خاموشی ہمیں یہودیت کے ظلم سے زیادہ اذیت دے رہی ہے۔ مسلمان حکمران اپنی حکمرانی میں مصروف ہیں وہ ایسے خطرناک ظالم بن چکے ہیں جو اپنے جیسے مسلمانوں کو خون، سسکتے اور تڑپتے دیکھ کر خاموش ہیں۔ تم مسلمان تو ہو مگر مسلمان کہلانے کے حقدار نہیں، تم دیکھنے کے باوجود اندھے ہو، تم لوگ سننے کے باوجود بہرے ہو، تم لوگ منافقت کا لبادہ اوڑھے رکھو، یاد رکھو ہم نے اپنی جانیں دے دی ہیں اور ہم دیتے بھی رہیں گے مگر کل قیامت کی صبح ہم رب کے سامنے پوچھیں گے۔

اے مسلمانو، گونگوں، بے زبانوں تم کہاں ہو؟

یاسمین ناز

الٰہی کیا یہ آپ کے وہ نام لیوا مسلمان ہیں جنہوں نے اس وقت آواز نہیں اٹھائی جب ہمیں ذبح کیا جارہے رہا تھا، ہمارے بدن ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینکے جارہے تھے، ہماری عزتیں تارتار کی جارہی تھیں، جس پر آسمان بھی اشکبار تھا، انسان تو انسان جانور بھی رونے پہ مجبور تھے مگر یہ پوری امتِ مسلمہ خاموش تماشائی بنی رہی۔ سوچو اگر محشر میں انہوں نے یہ شکایت کر دی تو ہم جائیں گے کہاں؟

اہلِ عزہ کی جب یہ دلدوز چیخیں میری سماعتوں سے ٹکراتی ہیں تو آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں اور نگاہیں جب آسمان کی طرف اٹھتی ہیں تو ایک ہے صدا نکلتی ہے اللہ مجھے اہلِ غزہ کے لیے ایک معاون اور اسرائیلی کتوں کے لیے خطرناک بم بنا کر بھیج تاکہ میں ان کے ہر کتے کو جہنم واصل کروں۔ اللہ ہم بے بس ہیں تو ہماری اور اہلِ غزہ کی مدد کر۔ ابھی میرا قلم رکا ہی تھا کہ مجھے ایک دلدوز آواز نے جگایا کہ تم کون سے مسلمانوں کو پکار رہی ہو؟

کن سے غیرت کی امید کر رہی ہو؟ نہیں وہ مسلمان تو اور تھے جن کی قیادت سترہ سالہ بچے کر کے دنیائے کفر پر ضربیں لگاتے رہے، اپنی کشتیاں جلاتے رہے، اپنے بدنوں کے ٹکڑے کرواتے رہے، ایک عورت کی عزت کے بدلے پوری دنیا میں آگ لگا دینے والا مسلمان تو آج نہیں۔ ہم ہیں وہ مسلمان جب وقت قیام آیا، ہم جھک گئے۔

ہم وہ غلام مسلمان ہیں جن کی آزادی کبھی ممکن نہیں کیونکہ ہمیں دنیائے کفر نے پیسے کا لالچ دے کر خرید لیا، انہوں نے ہم سے ہماری تہذیب، دین مذہب سب کچھ چھین لیا۔ وہ قوم جو پیسے پہ بک جائے اسے کیا، پتا شہید ہونا کیا ہے؟ اسے کیا پتا عزتوں کا، لٹنا کیا ہوتا ہے؟ میرا تعلق اس قوم سے ہے جو بے حسی کی انتہا پہ ہے۔

اسے کیا پتا ایٹم بم سے اڑتے ہوئے گوشت کے لوتھڑے کس طرح رب کے جنت میں داخل ہوتے ہیں۔

اے مسلمانو، گونگوں، بے زبانوں تم کہاں ہو؟

یاسمین ناز

یہ سب جاؤ آج اہلِ غزہ سے پوچھو۔
عرب ممالک کے علاوہ پوری دنیا میں جتنے بھی مسلمان ممالک ہیں ان کو میرا نہیں ان تڑپتے ہوئے لاشوں، چیختی چلاتی روحوں کا دکھ سناؤ۔ انہیں بتاؤ کم ضرف انسان سے بھی ایسا نہیں کرتے جو آپ کر رہے ہیں۔
اہلِ غزہ پر اسرائیلی بربریت کے بڑھتے ہوئے مظالم، خون میں رستے ہوئے بدن، بھوک سے تڑپتے ہوئے بچے، بمباری کی شدت سے تڑپتے ہوئے انسان، ایک ہولناک تصور پیش کر رہے ہیں مگر دوسری طرف کوئی بھی ایسا ملک نہیں جو ان کے لیے کم از کم آواز اٹھا سکے۔ ایک ایسا وقت ہے ہم مسلمان سب کے سب زندہ ہو کر بھی مر چکے ہیں اور اہلِ غزہ مر کر زندہ ہو رہے ہیں۔
اہلِ غزہ میں شرمندہ ضرور ہوں مگر میں آپ کی قربانیوں کو سلام پیش کرتی ہوں۔
ہے ناز کی التجا صرف اتنی سی اے اہلِ مسلم اس صحنِ چمن کی طرف دیکھو جہاں خون ہی خون ہے۔

عورتوں کا عالمی دن

فائزہ شہزاد

8 مارچ کو پوری دنیا میں عورتوں کا دن منایا جاتا ہے۔ ویسے تو ایک صدی سے زائد ہو گیا ہے کہ پوری دنیا میں یہ دن منایا جاتا ہے مگر کچھ سالوں سے یہ ہمارے ملک میں بھی منایا جا رہا ہے مگر ہماری بدنصیبی ہی کہہ لیں کہ ہمیں معلوم کچھ نہیں ہوتا مگر بھیڑ چال چلتے ہوئے ہم ایک دوسرے کے پیچھے بغیر سوچے سمجھے چل پڑتے ہیں اور میرا جسم میری مرضی جیسے مسائل جنم لیتے ہیں۔ پہلے تو آیئے ماضی میں چلتے ہیں تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ اصل حقیقت کیا تھی؟ عورت کیوں مجبور ہوئی کہ سڑکوں پہ نکلے؟ اگر ہم تاریخ پر نظر دوڑائیں تو معلوم ہو گا کہ سب سے پہلے آرگنائزڈ ایکشن 8 مارچ 1875ء کو نیویارک میں ورکنگ ویمنز نے لیا۔ یہ وہ تمام عورتیں تھیں، سینکڑوں کی تعداد میں جو گارمنٹ فیکٹریز اور مختلف ٹیکسٹائل فیکٹریز میں کام کرتی تھیں مگر ان کو پورے حقوق نہیں مل رہے تھے۔ مردوں سے زیادہ کام وہ کرتی تھیں مگر تنخواہیں بے حد کم اور اوقاتِ کار حد سے زیادہ اور جو تنخواہ تھی وہ بھی ٹائم پر نا ملتی تھی، ان سے غیر انسانی سلوک روا رکھا جاتا تھا جس پر ان عورتوں نے مجبور ہو کر پہلا جلوس نکالا اپنے حقوق کے لیے۔ اس کے بعد 1910ء میں انٹرنیشنل کانفرنس آف ورکنگ وومن کا اجلاس کوپن ہیگن میں ہوا۔ کلارا زیٹکن (Clara zetkin) نامی عورت نے یہ آئیڈیا دیا کے 8 مارچ کو پوری دنیا میں ہر ملک میں عورتوں کا دن منایا جائے جسے باقاعدہ UNO کے اشتراک سے شروع کیا گیا اور سب سے پہلے یہ دن 1911ء میں آسٹریلیا، ڈینمارک، جرمنی اور سویٹزرلینڈ میں منایا گیا۔ اس دن کا اصل مقصد پوری دنیا میں عورت کی عزت و تکریم اور صنفی مساوات (gender equality) کے بارے میں آگاہی دینا ہے۔

عورتوں کا عالمی دن

فائزہ شہزاد

یورپین ملکوں میں تو اس کی ضرورت ہو گی مگر ہمارے دین اور اسلام نے تو ہم عورتوں کو جو حقوق دیے ہیں وہ کسی اور مذہب میں کہاں؟ آقائے دو جہان ﷺ نے آج سے 1436ء سال پہلے عورت کو جو حقوق جو مقام دے دیا ہے وہ تا قیامت کبھی نہ مٹ سکے گا۔ اسلام سے پہلے عورت کو ایک جوتی کے برابر بھی نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ پیدا ہوتے ہی زندہ گاڑھ دیا جاتا تھا مگر اسلام کے آتے ہی نبی پاک ﷺ نے جو درجہ دیا ہے عورت کو وہ کسی انمول خزانے سے کم نہیں۔ اب اگر عقل و شعور کو استعمال کرتے ہوئے دیکھا جائے تو ہماری عورت کو سڑک پر آنے کی ضرورت ہی نہیں۔ پوری دنیا کو ایک صدی سے زائد ہو گیا یہ دن مناتے ہوئے مگر پاکستان میں چند سال ہی ہوئے ہیں مگر گویا اس دن نے بھونچال ہی مچا دیا ہے بلکہ سونامی کہنا زیادہ بہتر ہو گا۔

پاکستان میں میرا جسم میری مرضی کہنے والی عورت کو یہ تک معلوم نہیں کے اٹلی کی فیمینسٹ نے اس دن کے لیے mimosa جسے ہم اردو میں چھوئی موئی کہتے ہیں اس کا سمبل استعمال کیا ہے، اس نام کی گہرائی میں جائیں تو عورت ایک طاقت کا مظہر ہے، چاہے وہ کسی بھی روپ میں ہو وہ عقل و دانش اور حساسیت کی علمبردار ہے اس کو شرم بوٹی بھی کہتے ہیں، اس پر زرد رنگ کے خوبصورت پھول لگتے ہیں جو ایک دوسرے سے ایسے جڑے ہوتے ہیں جیسے عورت ہر روپ، ہر کردار میں اپنوں سے جڑی ہوتی ہے، چاہے وہ ماں ہو، بہن ہو، بیوی ہو کہ بیٹی اور ذرا سا ہاتھ لگانے سے اس کی پتیاں سکڑ جاتی ہیں۔ سمٹ جاتی ہیں جیسے کہ عورت شرم و حیا سے سکڑی سمٹی ہوتی ہے کیونکہ شرم و حیا ہی تو اس کا اصل زیور ہے مگر افسوس صد افسوس کہ ہمارے ہاں ہر بات ہر عمل کو الٹ رنگ دے دیا جاتا ہے۔

عورتوں کا عالمی دن

فائزہ شہزاد

اس دن کا آغاز ہوا ورکنگ ویمن کے حقوق سے مگر آج کے دن جتنی عورتیں کام کر رہی ہیں۔ چاہے وہ گھروں کی ماسیاں ہو یا آفسز ورکر یا ڈاکٹرز یا کوئی ٹیچرز وہ سب اپنے اپنے اداروں میں بیٹھی کام کر رہی ہیں اور سڑکوں پہ کون نکلا ہے اپنے حقوق کی جنگ لڑنے، یہ تمام وہ عورتیں ہیں جن کو تمام حقوق حاصل ہیں، جن کے شوہر حضرات، باپ، بھائی سب ان کے ساتھ ہیں، ان کو آٹا، دال چاول کا بھاؤ بھی معلوم نہ ہو گا اور نہ کوئی فکر فاقہ ہو گا۔ یہ سب فیمینسٹ ہیں اور اپنی موج مستی کے لیے نکلے ہیں۔ اس میں قصور اس عورت کا نہیں اس کے گھر والوں کا ہے، جن کی مرضی سے، جن کی اجازت سے وہ سڑک پر نکلی ہے جبکہ ہمارے معاشرے میں وہ دور افتادہ گاؤں میں بیٹھی عورت جس کو نہ آج کا دن معلوم ہے اور نا اپنی زندگی کا مقصد نہ اس کو تو اپنی مرضی سے جینے کا بھی حق حاصل نہیں، اسے کبھی غیرت کے نام پر قتل تو کبھی کاروکاری کر دیا جاتا ہے۔

اصل جنگ تو ان کے حقوق کی ہے اصل جنگ تو ان کے حقوق کی ہے جن کو وراثت سے محروم کر دیا جاتا ہے، قرآن سے شادی کر کے اسے زندہ درگور کر دیا جاتا ہے اور نا جانے کیا کیا ظلم و ستم ہو رہا ہے اس بے بس عورت کے ساتھ جو کہ سوائے اس کے اور اس کے رب کے کوئی نہیں جانتا مگر اے دخترِ اسلام ذرا امہات المومنین کی طرف دیکھ، جگر گوشۂ رسول ﷺ کی زہرا بتولؓ کی شرم و حیا کو دیکھ، حضرت عائشہؓ کی عفت و عصمت کو دیکھ جس کی پاکیزگی کی گواہی خود ربِ کائنات نے قرآن پاک میں دی ہے جن کی وجہ سے عورت کو اسلام نے اتنی عزت و عظمت بخشی اور اگر آج کی عورت ان پاکیزہ ہستیوں کو اپنا آئیڈیل بنا لے، ان کی طرزِ حیات پر اپنی اور اپنی آل اولاد کی زندگی بسر کرنے کا عزم کر لے تو ہمارا معاشرہ ایک بہترین معاشرہ بن سکتا ہے، بس تھوڑی سی ہمت اور بارش کا پہلا قطرہ بننا ہو گا۔

عورتوں کا عالمی دن

فائزہ شہزاد

اے دخترِ اسلام زمانے کی ہوا دیکھ
کیا وقت کے تیور ہیں۔
تیرا فرض ہے کیا دیکھ
فطرت نے ازل سے تجھے بخشی ہے امانت
ہاں دیکھ نا ہو جائے اس میں خیانت
ہر روپ میں چمکتا ہے تیرا مقدر
کتنا دلکش کتنا پیارا، سندر
اے دخترِ اسلام سمبھنال اپنی حیا کو
زیور ہے تیرا چھپا، اس شرم وحیا کو
تیور ہیں زمانے کے کڑے ذرا غور سے دیکھ
اے دخترِ اسلام زمانے کی ہوا دیکھ

اس سادگی پہ کون

فائزہ شہزاد

جیسے ہی میں گھر کے اندر گھسی تو کچھ جانی پہچانی کھانے کی خوشبو نتھنوں سے ٹکرائی، دل میں کہا: "اللہ کرے میری سوچ غلط ہو۔" میں نے زور سے آواز لگائی: "امی جان! کھانے میں کیا بنا ہے آج؟"

امی! "بیٹا جی! آلو کی بھجیا۔"

میں! "اف! اف! میرے اللہ جی! پھر سے آلو (دل کیا چیخ، چیخ کر روؤں)

امی! "ارے شکر کر کے کھایا کرو، مہنگائی اتنی ہو گئی ہے کہ جو بھی مل جائے اس پر صبر شکر کرو۔"

میں! "نہیں کھانے مجھے یہ آلو پیر آلو، منگل آلو، بدھ آلو، اب تو مجھے اپنی شکل بھی آلو جیسی ہی لگنا شروع ہو گئی ہے۔ آج مجھے کالج میں روبی نے بھی کہا کہ تم کیا آلو جیسی شکل بنائے بیٹھی ہو اور تو اور مجھے تو اپنی سانسوں سے مہک بھی "کولگیٹ" کی بجائے آلو ہی کی آتی ہے اور وہ دن دور نہیں جب پسینے سے بھی آلو ہی کی بساندھ آئے گی۔ ہنہ"

امی! "ارے چندا کیسی باتیں کر رہی ہو؟ کہاں سے خرچے پورے کروں ایک اکلوتے تمہارے ابا کی تنخواہ اور میں اکیلی جان کیسے گھر چلاتی ہوں یہ صرف میں "دکھیاری" ہی جانتی ہوں"۔

میں! "امی جی، بس رہنے دیں دل تھک گیا ہے آلو اور ٹینڈے کھا، کھا کر کاش میرے اختیار میں ہوتا تو آلو کی "فصل" تو کیا "نسل" ہی ختم کر دیتی آلو کے کھیت ہی جلا دیتی۔ لوگوں کے گھروں میں دیکھیں چائنیز کھانے بنتے ہیں، اٹیلین، ٹرکش، مغلیائی کھانے بنتے ہیں اور ایک ہمارا گھر ہے جہاں بس یہ مجھے نہیں معلوم، میں نہیں کھا رہی یہ مجھے شوارما منگوا کر دیں یا پھر برگر (چاہے وہ آنڈے والا ہی کیوں نا ہو؟)

امی! "دیکھو میری چندا! میری رانی، میری جان! لوگوں کی بات نہ کرو یہ فضول خرچیاں یہ سب چونچلے، پیسے والوں کے نخرے ہیں، ذرا مہنگائی کے حالات تو دیکھو۔

اس سادگی پہ کون

فائزہ شہزاد

وہ موئے کالے بینگن (لو جی ایک تو بینگن کو ویسے ہی کوئی نہیں پوچھتا اوپر سے کالا کہہ کر مزید بے عزتی) جن کو کبھی کوئی پوچھتا ہی نہ تھا آج وہ بھی پورے 160 روپے کلو ہوگئے ہیں۔ آج کو بچت کروں گی تو کل کو کام آئے گی نہ آخر کو تمھاری شادی کرنی ہے، کمال میاں (بڑے بھیا) کی دلہن لانی ہے اب یہ سارے کام ایسے ہی تو نہیں ہوں گے ناں"۔

میں! "رہنے دیں امی! شادی پر بھی لگتا ہے آپ آلو کی بریانی، آلو کا قورمہ، ٹینڈے کا مربہ اور آلو کی کھیر ہی بنائیں گی"۔ امی! "نا میری بچی! ایسے نہیں سوچتے، یہ جو چند پیسے میں ہر ماہ بچا، بچا کر رکھتی ہوں تو کیا میں قبر میں ساتھ لے کر جاوں گی؟ دیکھنا تو سہی۔ میری چندا میں کیسے اعلیٰ کپڑے، جہیز اور لذیذ کھانا دوں گی"۔

اپنی شادی کا سن کر میرے من میں لڈو پھوٹ گئے اور تصور میں خود کو دلہن کے روپ میں دیکھتے ہوئے، سامنے پڑے آلو کسی مرغ مسلم سے کم نہیں لگ رہے تھے اور مجھے شرمندگی ہو رہی تھی کہ خواہ مخواہ امی سے بحث کی، کتنی سادہ اور مجبور ہے میری ماں جو ہمارے لیے نجانے کیسے ہر ماہ جان پر سختی برداشت کرتی ہیں سادگی سے زندگی گزار رہی ہیں اور ایک میں ہوں ناشکری؟ "آلو کو مرغ کی ٹانگ کی مانند چباتی، مجھے امی جان کی آواز "حال" میں کھینچ لائی۔

امی! "بیٹا کھانا کھا کر برتن دھو کر سنبھال دینا اور رات کے لیے آٹا بھی گوندھ دینا آلو بھرے پراٹھے بنادوں گی رات میں (مجھے وہ پراٹھے کسی پیزے سے کم نہیں لگ رہے تھے) اور میں ذرا رضیہ بہن کی طرف جا رہی ہوں، تھوڑی دیر میں آجاوں گی دروازہ لگا لو جلدی سے آ کر"۔

اس سادگی پہ کون

فائزہ شہزاد

میں! حیرانگی سے "کیوں امی جی خیر تو ہے اتنی شدید گرمی میں؟" امی! "ہاں بیٹا! خیر ہی ہے وہ ذرا میں اور رضیہ یونیورسٹی روڈ تک جا رہی ہیں، سارے برانڈز پر سیل لگی ہے تو سوچا ذرا سات / آٹھ سوٹ ہی لے آؤں (میں نہال ہو گئی امی پر کہ لو جی جہیز کے لیے تیاری شروع کر دی امی جیئو ہزاروں سال) ایک بھی ڈھنگ کا سوٹ میرے پاس نہیں۔ آخر یہ موئی بچت کس روز کام آئے گی، قبر میں تھوڑی ساتھ لے جانے ہیں یہ پیسے (وہی ڈائلاگ اور سیاسی بیان) اس وقت امی مجھے اپنی ماں کم اور ساس زیادہ لگ رہی تھیں ابھی میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ امی جان سے کام کے وقت اور خاص کر ابا جی کے سامنے گھٹنوں کے ہاتھوں چلا نہ جاتا تھا۔

ایسے گیٹ پھلانگ کر بھاگی جا رہی تھیں گویا اولمپک مشعل روشن کرنے جا رہی ہوں اور میرے حلق میں آلو، توپ کے گولوں کی مانند پھنس رہے تھے اور دل کر رہا تھا کہ یہ آلو اٹھا کر دیوار تو کیا؟ پورے شہر میں "ایٹم بم" کی مانند برسا دوں۔
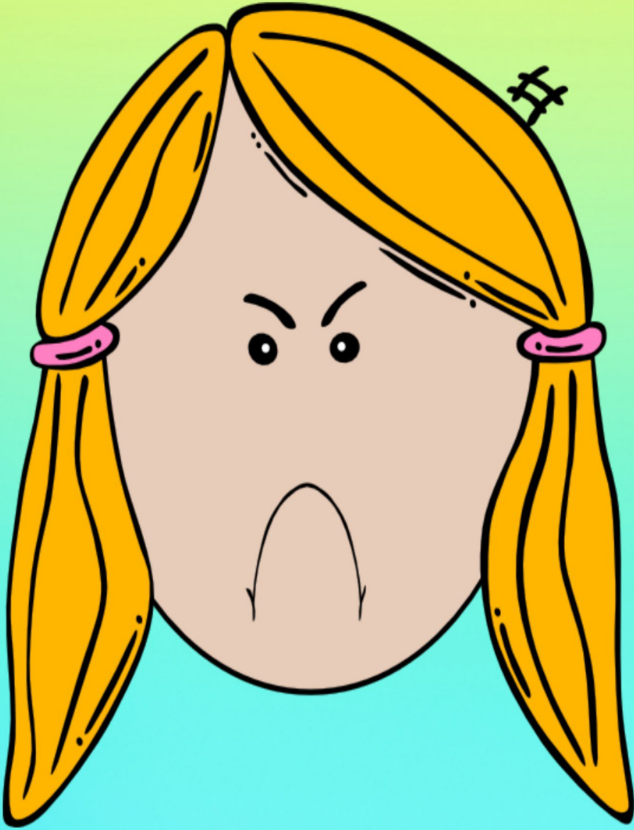
زرد پتے

اریبہ مظہر (سلانوالی، سرگودھا)

زرد پتوں کا دکھ جانتے ہو نہیں ناں کیونکہ یہ زرد پتے ان سے بھی دھتکار دیے جاتے ہیں جو ان کو پال کر سبز سے زرد ہونے تک خود میں سموئے رکھتا ہے مگر وہی درخت زردی مائل رنگت پر انہیں قبول نہیں کرتا ہے بلکہ ان کو گرا کر خود کو بوجھ سے آزاد کرا لیتا ہے۔

یہ شخص بھی بیٹھا ندی کنارے اپنی گزری حیات پر نادم و شرمندہ تھا۔ اس کی مثال بھی زرد پتوں جیسی تھی جو اپنوں سے دھتکارے ہوئے تھے۔

روحیل صاحب گھر کے لاڈلے اور چھوٹے بیٹے تھے۔ سارا بچپن مشکل میں گزرا تھا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ انہوں نے ترقی کی۔ اپنے خاندان کا نام روشن کیا اور اپنے بڑے دو بھائیوں کو ان کی اولادوں سمیت پالا اور اب تک ان کا خیال رکھتے تھے۔

روحیل صاحب نے اپنے والد سے پسند کی شادی کا اظہار کیا مگر نہ مانے اور ان کی شادی اپنی بھتیجی سے کرا دی۔

رافیہ بیگم خوش تھی کیونکہ وہ روحیل کو چاہتی تھی مگر روحیل صاحب خوش نہیں تھے۔ خیر انہوں نے اس کو مقدر سمجھ کر سمجھوتا کر لیا اور زندگی میں آگے بڑھ گئے تھے۔ ان کی ایک بیٹی تھی اور زندگی کو دوبارہ موقع دیا مگر اچانک اک دن ان کے ہنستے بستے خاندان کو سازش کی نظر کر دیا گیا ہنستا بستا خاندان بکھر کر رہ گیا۔

"ابو جان! ابو جان! یہ دیکھیے روحیل کے کارنامے عمر کے اس حصے میں جب اس کی بچی جوان ہے وہ اب بھی اس غیر عورت کے چکر میں ہے اور ملاقاتیں کرتا ہے۔"

جاوید صاحب اور قادر صاحب چیختے ہوئے اپنے والد سے کہنے لگے اور ساتھ ہی جعلی تصاویر بھی دیکھائیں جس پر ان کے والد طیش میں آ گئے۔ "روحیل! روحیل! کہاں ہو؟ ابھی کے ابھی ہماری بات سنو"۔

زرد پتے

اریبہ مظہر (سلانوالی، سرگودھا)

وہ آپے سے باہر ہوتے ہوئے کہنے لگے۔ روحیل اپنی بیوی بیٹی سمیت حاضر ہوئے لاونج میں کھڑے ہو گئے۔
وہ کڑک دار آواز میں بولے: "یہ دیکھو رافیہ! یہ دیکھو اپنے شوہر کے کرتوت۔ یہ روز دیر سے اس لیے آتا ہے کیونکہ یہ اس غیر عورت کے پاس جاتا ہے اس سے تعلق رکھا ہوا، اس نے سب سے چھپا کر دیکھو لٹ گئی میری بھتیجی۔ خدا غارت کرے روحیل میں تمھیں ابھی اور اسی وقت عاق کرتا ہوں اس گھر اور گھر کے رہنے والوں سے تمھارا کوئی تعلق نہیں۔ دفع ہو جاؤ، میری نظروں سے اوجھل ہو جاؤ"۔
ان کی آواز سارے گھر میں گونج رہی تھی اور سب سکتے کے عالم میں تھے مگر جاوید اور قادر کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ تھی کہ اب ساری جائیداد ان دونوں کی تھی ان کا منصوبہ کامیاب ٹھہرا۔ دونوں بھائی حسد میں اپنے خونی رشتے کو کھو بیٹھے تھے۔

روحیل صاحب کچھ نہیں بولے کیونکہ وہ سب کی نظروں میں بے اعتباری دیکھ چکے تھے۔ سو چپ چاپ چلے گئے ہمیشہ کے لیے ان سب سے دور بس گئے وہ ہر روز ندی کے کنارے بیٹھ کر گھنٹوں سوچتے رہتے تھے پھر خود کو کمرے میں بند کر لیتے اور زیادہ تر ذکر اذکار میں مصروف رہتے تھے۔ وہ ان زرد پتوں کی طرح تنہا رہ گئے جو دوسروں کو بچانے میں خود کو گنوا دیتے ہیں۔ دوسروں کی خوشیوں کی خاطر خود کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔
ان کی زندگی کو ان کے اپنوں نے بہار سے خزاں میں بدل دیا تھا۔ دولت کی لالچ میں انہوں نے سگے بھائی کو گنوا دیا اور خود کو فاتح سمجھ بیٹھے۔ اصل تو خسارے میں تھے وہ لوگ ہمیشہ کے لیے۔ وقت کا حساب ان کو مات دے گا۔

زرد پتے

اریبہ مظہر (سلانوالی، سرگودھا)

روحیل صاحب نے ہمیشہ خود کو نظر انداز کر کے دوسروں کی زندگیوں میں خوشیاں دیں، ان کی حیات کو رونق بخشی تھی پر صد افسوس کہ ان کے سگے رشتوں نے ان کی زندگی برباد کر دی تھی۔

زرد پتوں کی طرح گرد راہ میں بکھیر دیا اور مڑ کر ان کا پتا معلوم نہ کیا تھا۔ خود کی دنیا میں مطمئن مگر تنہا رہنا سیکھ گئے۔ ہائے لیکن یہ سب تکلیف دہ بہت ہوتا ہے مگر تھی تو اٹل اور واضح حقیقت ان زرد پتوں کے جیسی۔

حصہ شاعری

غزل

ظفر اقبال خاموشؔ

شہر کی الٹی روایات سے ڈر جاتا ہوں
دن کے ہوتے ہوئے ظلمات سے ڈر جاتا ہوں

اب تصور میں ابھرتے ہیں عجب نقش و نگار
اب میں اپنے ہی خیالات سے ڈر جاتا ہوں

خوف آتا ہے کبھی اپنی ہی ہستی سے مجھے
اور کبھی ارض و سماوات سے ڈر جاتا ہوں

شب کے ماتھے پہ ڈراتا ہے ستاروں کا ہجوم
چاندنی رات کے نغمات سے ڈر جاتا ہوں

اب ڈراتے ہیں اندھیروں میں چمکتے جگنو
یہ نہیں ہے کہ سیہ رات سے ڈر جاتا ہوں

ہم نوا کوئی نہیں شہر کے ویرانے میں
خود کلامی کے تجربات سے ڈر جاتا ہوں

وحشت شہر بھگاتی ہے مجھے سوئے وطن
گھر پلٹتے ہی مضافات سے ڈر جاتا ہوں

رفیقؔ چوگلے

ہم محبت شناس لوگوں کو
لوگ طرزِ سخن سکھاتے ہیں

یہ تو ایسا ہوا پرندوں کو
لوگ اڑنے کا فن سکھاتے ہیں

نظم

رقیہ مظفرپوری (بہار، انڈیا)

بھیا بھیا پیسے دو ناں
مجھ کو اب آتا ہے رونا

دعوتِ خانہ آبادی ہے
میرے گڈے کی شادی ہے

شربت، برفی بھی لانی ہے
دعوت میں تو بریانی ہے

آپ جو پیسے دے دو گے تو
بریانی بھی دوں گی تم کو

ورنہ بھیا یہ ناں کہنا
مجھ کو بھی تھوڑا سا دینا

بھیا کو تھا جال میں پھنسنا
بولے لے لو آؤ بہنا

تم ہو ہی تو پھر کیا کہنا
بریانی تو تم ہو بہنا

تیرے دم سے ہی تو بہنا
چھم چھم چھم چھم کرتا انگنا

نظم

رقیہ مظفرپوری (بہار، انڈیا)

مجھ کو بھی اب دعوت دو ناں
میں بھی گاڑی سے آؤں گا

مسکائی پھر لب کو کھولی
بہنا خوب اترا کر بولی

سن لو بھیا بات ہماری
پھر ڈھیلی ہو جیب تمھاری

یہ نہ کہنا بہن دلاری
میرے دل سے جان سے پیاری

جو باقی ہے کل دے دوں گا
پکا بہنا میں دے دوں گا

جو سمجھا دیں مان لے بہنا
میں تھوڑی ہوں طوطا مینا

آج نکالو جیب سے پیسے
کل بولو گے کیسے پیسے

بھیا سے یوں پیسا لینا
ہاہا ہاہا ہاہا ہاہا

غزل

حمزہ ارشد

جا ڈھونڈ کوئی اپنا مقابل تلاش کر
چل راہِ راست پر نئی منزل تلاش کر

جس سے بجھے چراغ، کسی شام میں ترے
ان سب ہواؤں کی کبھی محفل تلاش کر

جس نے چراغِ زندگی تیرا بجھا دیا
تُو جا وہ خواہشات کا قاتل تلاش کر

کشتی خدا کی آس پہ دیتا ہوں چھوڑ میں
مشکل میں بیٹھنے سے تو ساحل تلاش کر

حمزہؔ جہاں پہ آس کا محور ہو ایک ذات
تو جا کہیں پہ اور وہ محفل تلاش کر

منزلِ مقصود

ڈاکٹر نایاب ہاشمی

پھولوں کی خوشبو
نرم خنک ہوائیں
دھیمی دھیمی پکار
پرسوز آہ و بکا
اشک لٹاتے، آہیں بھرتے احباب
تیاریاں ہو رہی ہیں رخصتی کی
غسل دے کے تیار کیا گیا
نہلایا گیا خوشبوؤں سے
پہنایا گیا نیا پاک و معتبر لباس
پرلطف تبسم ہے لبوں پر
رخصتی کا وقت آ گیا
سوار کرایا گیا سواری پر
جسے تھامے ہوئے تھے چار لوگ
لا الٰہ الا للہ، اللہ اکبر کی صدائیں
دولہا چلا ہے باراتیوں کے سنگ
ہے روشنی ہی روشنی چاروں اور
لمبا سفر ہر قدم پر سمٹ رہا ہے
پہنچایا گیا منزل پر

منزلِ مقصود

ڈاکٹر نایاب ہاشمی

لوٹایا گیا مملوک کو مالک کے پاس
اور لوٹ آئے باراتی، دولہے کو
چھوڑ کر
سسکتے، آہ بھرتے، سینہ سہلاتے،
اشک بہاتے، لوٹ آئے
واپس لوٹ آئے
جانا ہے ہمیں بھی
پھر جمے گی محفل
پھر ہوں گے باراتی
پھر ہوں گے دولہا یا دلہن
پھر ہو گا ڈولا
پھر ہو گا سفر
پھر ہوں گے سسکتے لمحے
آہیں بھرتی ساعتیں
پھر آئے گا وقت ایسا ہی
بار بار، کئی بار، کب تک؟
جب تک ہم سب نہ پہنچ جائیں
منزلِ مقصود تک

بس تم

فریال عارف

تم پوچھتے ہو کیا ہو تم؟
تو سنو
میرے لیے آغاز ہو تم
آغاز کے بعد انجام بھی تم
میرے سر پر ٹھہرا آسمان تم
پیروں تلے رکھی زمین بھی تم
میرا ساز تم، آواز تم
دل پر پہلی دستک تم
سر پہ سجا وہ تاج تم
پیروں میں بندھی وہ پائل تم
آنکھوں میں ٹھہرے خواب تم
دل میں پنپتی خواہش تم
آنکھوں میں ٹھہری نمی تم

بس تم

فریال عارف

خیالِ دل بھی تم ہی تم
بے مول ہوا وہ آنسو تم
جس کا سبب بس تم ہی تم
جکڑ رکھا مجھے جس نے
وہ ان دیکھی زنجیر تم
ناقابلِ بیاں احساس تم
زبان پر دھرے الفاظ تم
غموں سے بھری، زندگی تم
تڑپاتی ہوئی وہ یاد تم
فقط تم ہی تم ہو میرے ارد گرد
میری دنیا تم، سارا جہاں تم
گر پھر بھی نہ سمجھو، کیا ہو تم
تو نادان بہت انجان ہو تم

رمز خاموشیاں

اریبہ مظہر (سلانوالی، سرگودھا)

سنو جاناں
میری خاموشی تمھیں روز
چیخ چیخ کر پکارتی ہے
سنو کیا تم کو رات بھر
نیند وہ کیا
اف سکون کی آتی ہے کیا؟
کیا جگنو، تارے اور چاند
تمھیں میرے حالِ دل
میری گراں طبعیت کے بارے
میں کچھ نہیں بتاتے کیا؟
یا پھر
سنو جاناں
تم ان کو سن کر نظر انداز
کرتے ہو
یعنی کہ خود کو میری قید سے
آزاد کرتے ہو

رمز خاموشیاں

اریبہ مظہر (سلانوالی، سرگودھا)

تو کیا ایسا کرنے کی سعی میں
خود کا ہی وقت برباد کرتے ہو
تو سنو جاناں
نہ تم منہ پھیر سکو گے
نہ تم آزاد ہو سکو گے
اس ان دیکھی قید سے
تم کو رہنا ہے عمر بھر
یونہی میرا حال ان
چاند، تاروں اور جگنوؤں سے
جاننا ہے ہر روز و شب
تو سنو جاناں
کیا تمھیں میری خاموشی کچھ
نہیں کہتی